کوئی روایت مستند نہیں ہو سکتی لیکن خود زیرِ نظر مجموعہ کے پہلے مضمون کے پہلے ہی صفحہ پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا نام تین طرح سے لکھا گیا ہے، سلطان المشائخ نظام الدین اولیا، سلطان المشائخ، حضرت نظام الدین اولیاؒ کیا اس کی وجہ سے اس تحریر کو بے اصل اور الحاقی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابن کثیرؒ - مرتبہ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۲ قیمت للعہ پتہ شعبۂ نشر و اشاعت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

حافظ ابن کثیرؒ آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز علما میں تھے ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی نے ان پر عربی زبان میں تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، اس مقالہ کا ابھی پہلا حصہ شائع ہوا ہے اس کے شروع کے تین ابواب میں، ابن کثیرؒ کے زمانہ کی علمی، فکری، سیاسی، اور تمدنی حالت ان کے نسب خاندان اعزہ اور وطن کے متعلق معلومات اور ان کی تعلیم و تربیت، علمی سفر اور اساتذہ وغیرہ کا تذکرہ ہے چوتھا باب ابن کثیرؒ کے کارناموں پر مشتمل ہے اس میں ان کے درس، تصنیفات، شاعری اور تلامذہ کا ذکر ہے، لائق مصنف نے ابن کثیرؒ کی تصنیفات کو خاص ماخذ بنایا ہے، اس طرح اس میں انکے بعض ایسے شیوخ، تلامذہ اور تصنیفات کا بھی ذکر ہے جن سے قدیم تذکرے خالی ہیں مصنف نے بعض غلط واقعات کی تردید اور مختلف روایتوں میں جمع و تطبیق بھی دی ہے ان کی محنت لائق تحسین ہے مگر پہلا باب مختصر ہے اس میں ابن کثیرؒ کے پر آشوب دور کا اور مفصل ذکر ہونا چاہیئے تھا،

ضروری تصحیح - گذشتہ شمارہ کے آخری صفحہ پر کتابت کی غلطی سے یہ چھپ گیا ہے "سیرتِ شامی کوئی کتاب نہیں" اس کو یوں لکھا گیا تھا، "سیرتِ شامی کوئی قدیم کتاب نہیں" کیونکہ محمد بن یوسف (م سنہ ۹۴۲ھ) کی کتاب سبیل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد کا شمار قدیم کتب سیرت میں نہیں ہوتا، یہ سیرتِ شامی کے نام سے مشہور اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، اس نمبر میں اس کی تصحیح کی جانے والی ہی تھی کہ معارف کے دیرینہ کرمفرما اور نامور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے اپنے مکتوب گرامی میں اس کی جانب توجہ دلائی جس کے لئے ہم ان کے بہت شکر گذار ہیں ان ہی سے معلوم ہوا کہ اگر چھپی تو دس بارہ جلدوں میں آئے گی،

(ض)

جلد ۱۲۵ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۲

مضامین

مقالات

بَابُ التَّقرِیظِ وَالانتِقَاد

شذرات

ندوۃ العلماء کے ناظم، دارالمصنفین کی روحِ رواں، ہندوستان کے جید عالم، عربی اور اردو کے دلنواز ادیب و انشاپرداز، عالمِ اسلام کے نامور مصنف اور خطیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس سال شاہ فیصل ایوارڈ ملا ہے، جو اسلامی ممالک کا گویا نوبل پرائز ہے،

سعودی عرب کے سابق فرمانروا شاہ فیصل شہید پر دنیا کے مسلمانوں کو بجا طور پر ناز ہے، وہ اپنی اسلامی حمیت اور غیرت کے لحاظ سے فخرِ اسلام تھے، اُن ہی کی یاد میں یہ ایوارڈ قائم ہوا ہے، اس کا پہلا ایوارڈ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دیا گیا، دوسرا جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ملا جس سے نہ صرف اُن کی ذات گرامی بلکہ ہندوستان کے نام کو بھی اسلامی ممالک میں فضیلت حاصل ہوئی، اب تک ہندوستان کی تین جلیل القدر شخصیتوں کو نوبل پرائز بھی مل چکے ہیں، سر رابندر ناتھ ٹیگور کو اُن کے شعری اور ادبی کارنامے، سر سی وی رمن کو اُن کی سائنسی تحقیقات اور ابھی مدر ٹریسا کو اُن کی انسانی ہمدردی و خدمات پر، اس انعام سے نوازا گیا، ہندوستان کو ان تینوں شخصیتوں پر فخر ہے، تو اب اس کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قابلِ قدر ہستی پر بھی ناز ہے، کہ شاہ فیصل ایوارڈ سے اُن کے علم و فضل کا اعتراف اسلامی دنیا میں کیا گیا،

وہ اس وقت نہ صرف علم کی آبرو ہیں بلکہ اپنی گوناگوں ذاتی خوبیوں کی وجہ سے عطرِ مجموعہ ہیں، نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، پاک دل، اور پاکباز ؏:-

اُن کی ادا دل فریب، اُن کی نگہ دل نواز

وہ اپنی گفتار کی شان اور کردار کی آن میں ان بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو دین کے رُہبان رہے ہیں، وہ ایامِ دنیا کے مرکب کبھی نہیں بنے، بلکہ اس کے راکب بن کر زندگی بسر کر رہے ہیں،

وہ بڑے اچھے خطیب اور بڑے اچھے اہلِ قلم بھی ہیں، اُردو میں بولنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صداقت، عدالت اور پیامِ انسانیت کا درس دے کر اپنے سامعین کو دنیا کی امامت کے لئے تیار کر رہے ہیں، عربی میں بولتے ہیں تو اپنے منظوب گمان حاضرین کے دل میں یہ یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ

وہ محبت کی زبان، معمارِ جہان اور دنیا کی عزت و ناموس کے پاسبان ہیں، اُن کی تقریریں قلمبند کر دی جاتی ہیں، تو ان میں دلنشین تحریروں کی لذت ملتی ہے، اور پھر اُن کی بعض تحریریں ایسی بھی ہیں جن کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دل پذیر تقریر سامعہ نواز ہو رہی ہے، ان کا شمار اس وقت اسلامی ممالک کے ممتاز ترین خطیبوں میں ہوتا ہے،

اُن کے قلم کی گل فشانیاں بہت سی کتابوں میں ظاہر ہو چکی ہیں، اُن میں نغمۂ عشرت بھی ہے اور نالۂ ماتم بھی ہے، سرمایۂ گداز بھی ہے، اور نوائے درد بھی، وہ جب کوئی چیز اردو میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے پر یہ اثر طاری ہوتا ہے کہ وہ اُسکے ضمیر لالہ میں چراغ آرزو روشن کر رہے ہیں، عربی میں لکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ حدیثِ سوز و سازِ زندگی بیان کر رہے ہیں، شام کے مشہور ادیب علی طنطاوی نے لکھا ہے کہ وہ انکی عربی نثر میں کھویا ہوا نغمہ پاتے ہیں اور بے ردیف و قافیہ کی شاعری بھی،

اُن کی شہرت "سیرت سید احمد شہیدؒ" سے پھیلی جس میں یہ پیام ہے کہ دنیا میں ثباتِ زندگی ایمانِ محکم ہی سے ہے اور ایک راسخ مسلمان تندرو بن کر کس طرح کوہ و بیاباں سے گذر سکتا ہے، اور بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ کتاب مسلمانوں کے ہاتھوں میں رشد و ہدایت اور عزم و ہمت کا ایک صحیفہ ہے، انھوں نے اس کا عطر کھینچ کر عربی ممالک کے لئے عربی میں بھی اِذَا هَبَّتْ رِيحُ الْإِيمَانِ کے نام سے پیش کیا، جو اردو میں "جب ایمان کی بہار آئی" کے عنوان سے شائع ہوئی،

ان کا رسالہ "مذہب و تمدن" وہ مقالہ ہے جو ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک منتخب جلسہ میں پڑھا گیا، اس میں انھوں نے اس وقت اپنے سامعین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اگر اُن کو زندہ رہنا ہے تو اُن کو موجودہ مادی تمدن کے دریا کے رخ کے خلاف تیرنا پڑے گا، بلکہ اس کا رُخ بھی پھیرنا ہوگا، اُن کو اپنے افکار و خیالات اور رسوم و عادات کی سب سے پہلے قربانی دینی ہوگی، جو مادی تمدن اور نظامِ حیات میں رہنے کی وجہ سے اُن کی زندگی کا جزء بن گئی ہیں، یہی پیام وہ اپنی پوری زندگی میں دیتے رہے ہیں،

عربی میں ان کی ایک اہم تصنیف مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِيْنَ ہے جس کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" ہے، اس میں انھوں نے بڑی دلسوزی اور جگر کاوی سے اس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں میں جب حاسۂ مذہبی اور خدا طلبی کا عالمگیر فقدان ہوا

اور وہ دنیا طلبی کے بحران میں مبتلا ہوئے، تو پھر اُن کی بے ہمتی، پست خیالی اور تن آسانی سے زوال پیدا آیا، مگر وہ یہ بھی پیام دیتے ہیں کہ ان کی خاکستر میں اب بھی شرار آرزو ہے، وہ خواب گراں سے اٹھ کر اپنے اشک صبح گاہی سے وضو کریں تو اب بھی ناموس ازل کے امین بن کر معمار جہاں بن سکتے ہیں، یہی صدا اُن کے دل سے برابر اٹھتی رہی،

اُن کی کتاب "مولانا محمد الیاس اور انکی دینی دعوت" میں اس دعوت و تبلیغ کے علمی اصول اور اس تبلیغ کے عملی آئین کا ولولہ انگیز تذکرہ ہے جس سے نام کے مسلمان کام کے مسلمان اور قومی مسلمان اصلی مسلمان بن سکتے ہیں،

۱۹۵۱ء میں مصر، سوڈان، شام اور فلسطین کے سفر پر گئے، تو انھوں نے عربی میں اپنا سفرنامہ مذکرات سائح فی الشرق العربی کے نام سے لکھا جس کو جماعۃ الازہر للتالیف والترجمہ والنشر نے شائع کیا، اردو میں مزید اضافہ کے ساتھ یہ شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے چھپا ہے، اس سفر میں وہ اسلامی تحریکات کے داعیوں، مصلحوں، مفتیوں، تعلیمی اداروں کے استادوں طالب علموں اور حکومتوں کے عہدیداروں سب ہی سے ملے، وہاں کی علمی مجلسوں میں جو تقریریں کیں یا جو مضامین پڑھے، یا وہاں کے لوگوں سے جو باتیں کیں، ان سب میں اُن کے سوز دل کی وہی چنگاریاں ہیں جو اُن کے دل میں برابر بھڑکتی رہتی ہیں، اُن کے دو اور سفرنامے دو ہفتے مغرب اقصیٰ میں اور دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ہیں، ان میں بھی ان ممالک کی ذہنی اور روحانی کشمکش کا محاسبہ ہے، وہ دار العلوم دیوبند میں ایک مقالہ پڑھنے کے لئے مدعو کئے گئے تو انھوں نے اپنے مقالہ "طالبان علوم نبوت کا مقام" میں دور جدید کے فتنوں کی طرف توجہ دلا کر اُن کو یہ پیام دیا کہ نئے ماحول کی ذمہ داریوں سے گریز اور زمانہ سے شکست کھا جانا مردوں کا کام نہیں، یہ ایک رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہوا،

اسی زمانہ میں انھوں نے یوپی کے مختلف شہروں میں تقریریں کیں، جن میں یہ بتایا کہ دنیا پر خودغرضی اور بد اخلاقی کا افسون چھایا ہوا ہے، اسے جادروں سے نہیں روکا جا سکتا ہے، مگر ہم اپنے کو اس طرح سنوار سکتے ہیں، کہ ہم انسانیت کا درد محسوس کریں، اور اپنے ملک کو ایک نمونہ کا ملک

بنا دیں جس میں ایمان، یقین، اخلاق، ہمدردی، اور ایثار کی فضا ہو، ان تقریروں کا مجموعہ پیام انسانیت کے نام سے طبع ہوا، اور یہ پیام اُن کی رگ جاں بن گیا ہے،

ان کی تاریخ دعوت و عزیمت میں ان کے قلم کی روانی اور تحریر کی رعنائی سے ان کے ایمانی جوش کی ولولہ انگیزی کچھ اس طرح نمایاں ہوئی ہے کہ اسکی تین جلدیں جادۂ زندگانی میں مردوں کے لئے شمشیریں ہیں، اس کے ترجمے انگریزی اور عربی میں بھی ہوگئے ہیں،

انھوں نے تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی میں ایسی دوکان سجائی، جہاں سے جذب و شوق، اور درد و محبت کا سودا مل سکتا ہے،

دمشق کے رسالہ المسلمون میں عربی میں ایک مضمون "ردۃ جدیدۃ" لکھ کر اسلامی ممالک کے لوگوں کی توجہ اس ذہنی ارتداد کی طرف دلائی جو یورپ کی لادینی سیاست اور مادی تمدن کی تاخت کے پیچھے آرہی ہے، اس کے مقابلہ کرنے کی کوشش کو مقدس ترین جہاد قرار دیا، اس کا اردو ترجمہ نیا طوفان کے نام سے شائع ہوا، پھر عربی میں القادیانی والقادیانیہ اور اردو میں قادیانیت لکھ کر اُس کو محض ایک مذہبی جسارت، جدت اور نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیا، یہ کتاب قادیانیوں کے سروں پر ایک خنجر بن کر لٹکی، ہندوستانی مسلمان "ان عربی تقریروں کا مجموعہ ہے جو عرب ممالک کیلئے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئیں، یہ عربی تقریریں المسلمون میں بھی شائع ہوتی رہیں، مزید اضافہ کے ساتھ اردو میں بھی شائع ہوئیں، اس سے ہندوستانی تمدن و تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے،

اُن کی سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری میں اخلاص، عشق الٰہی، استقامت علی الشریعت، اتباع صحبت، اصلاح اور ارشاد کی شمع فروزاں ہے، بڑے درد دل کے ساتھ عربی میں "موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیہ" لکھی جو اردو میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے نام سے طبع ہوئی، اس میں اس کا اظہار ہے کہ تجدد و مغربیت کے اثر سے اسلامی ممالک کے عوام و خواص میں اخلاقی کینسر پیدا ہو رہا ہے، مگر اس کا علاج یہ ہے کہ اگر اُن میں طاقتور ایمانی جذبہ اللہ کے نام پر اتباع و انقیاد کا ولولہ اور اخلاص پیدا ہو جائے تو وہ نبی خاتمؐ کی خیر الامت کی حیثیت سے موجودہ دور کی انسانیت کی آخری آس بن سکتے ہیں،

عربی میں اُن کی ایک اہم تصنیف النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن بھی ہے جس کا اردو ترجمہ

منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ہے، اس میں انسانی زندگی اور تمدن پر انبیائے کرام
کے احسانات دکھائے گئے ہیں، وہ وقتاً فوقتاً لندن، لیڈسن، برلن، جنیوا اور اندلس کے سفر پر بھی گئے، وہاں کی یونیورسٹیوں
اور علمی مجلسوں میں عربی میں تقریریں کیں، مضامین پڑھے، ان سب میں یہ پیام تھا، کہ یورپ کے مسلمان طلبہ
وہاں کے تمدن سے متاثر نہ ہوں، کیونکہ اس کا ظاہر روشن ہے اور باطن تاریک ہے، وہ اس سرزمین پر داعی بنکر
رہیں، اسلام کی ابدیت پر پورا اعتماد رکھکر مغرب مشرق کے درمیان نئی نہر سویز تعمیر کرنے کے خیال سے
اپنے وطن کو واپس جائیں، اردو میں یہ مجموعہ کچھ اضافہ کے ساتھ **مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں** کے نام سے شائع ہوا،

الطریق الی المدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر سرشارانہ انداز
کی تقریریں اور تحریریں ہیں، اس کا اردو ترجمہ **کاروانِ مدینہ** کے نام سے چھپا، پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا،

۱۹۶۷ء میں یہودیوں سے عربوں کو جو شرمناک شکست ہوئی تو مولانا کی اسلامی غیرت بڑے کار آئی، اس المیہ کو کویت
اور مکہ معظمہ میں بڑی دردانگیز تقریریں کیں، مضامین لکھے، مصر کے صدر جمال ناصر پر بڑی جرات مندانہ تنقیدیں کیں،
ان کا مجموعہ کویت سے **المسلمون وقضیۃ فلسطین** کے نام سے شائع ہوا، اضافہ کیساتھ اس کا
اردو ترجمہ **عالمِ عربی کا المیہ** کے عنوان سے چھپا، اس میں بڑی بیباکی لیکن بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کی طرف
توجہ دلائی گئی کہ عربوں کی اخلاقی کمزوری، دینی قدروں پر تیشہ زنی، فکری انارکی، ابن الوقتی، جھوٹے معیار کے تحت
سپر اندازی، باصرہ اور سامعہ کی لطف اندوزی کی بدولت یہ رسوا کن ہزیمت ہوئی، ان تحریروں سے عربوں کی غیرت پر ضرب کاری لگی،

مولانا بھوپال کے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بے حد متاثر ہوتے، ان کی باتوں
کی سوغات ہندوستان کے دوستوں کے سامنے پیش کرتے، پھر ان کی اٹھائیس مجلسوں کے ملفوظات کو اپنے ایک پرمغز
مقدمہ کے ساتھ **صحبتے با اہلِ دل** کے نام سے مرتب کیا تو یہ عرفانیات کا ایک گلدستہ بن گیا،

مولانا کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحئی اپنے دور میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے بھی بلند تر پایہ کے مصنف اور
عالم تھے، ان کی یادوں کی جوت **حیاتِ عبدالحئی** میں اس طرح جگائی ہے کہ ان کے حقیقی اعماق اور آفاق سامنے آجاتے ہیں،

اقبال پر بھی عربی میں **روائع اقبال** کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اقبال کے پیام عشق الٰہی اور عشق رسول
سے خود بخود نظر آتے ہیں، اور اپنے ناظرین کو بے خود بنانا چاہتے ہیں، عرب ممالک میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے سمجھے

گئے، اس کا اردو ترجمہ **نقوشِ اقبال** کے نام سے ہوا، انگریزی میں بھی یہ ترجمہ کی گئی،

الصراع بین المادیۃ والروحانیۃ کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھ کر یہ بتایا ہے کہ اگر سورہ کہف
کے مضامین کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اس میں عہد حاضر کی مادی تہذیب کی ملمع سازی اور باطل آرائی
کے زہر کا تریاق مل جائیگا، اس کا اردو ترجمہ **ایمان اور مادیت** کے نام سے ہوا،

انہوں نے عربی میں **الارکان الاربعۃ** لکھ کر نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دینی اور روحانی حکمتوں اور
ان کی مطلوب کیفیتوں کی تشریح ایسی ادبی خوبیوں کے ساتھ کی کہ یہ جدید حجۃ اللہ البالغہ کہلائی،
یہ ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا شاہکار ہے، اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوا،

ان کی اہم تقریریں رسالوں کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہیں، انہی میں ایک اہم مجموعہ **پاجا سراغِ
زندگی** ہے جس میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کو یہ پیام دیتے رہے ہیں کہ شاخِ ملت انہی کے دم سے ہری
ہو سکتی ہے، **پرانے چراغ** میں بہت ہی محبت اور درد سے اپنے ان محبوبوں کی بزم سجائی ہے جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں،

وہ امریکہ کے سفر پر بھی گئے ہیں، وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں اور مجلسوں میں جو تقریریں کیں، ان کا
مجموعہ عربی میں **احادیثِ صریحۃ فی امریکا** کے نام سے شائع ہوا، جس کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا، وہاں
انہوں نے صاف صاف کہا کہ امریکہ میں مشینوں کی تو بہار دیکھی لیکن آدمیت اور روح کا زوال پایا، وہاں
کے مسلمانوں کو تعلق باللہ، اپنے کاموں میں اخلاص اور انابت کی روح پیدا کرنے کی تلقین کی، یہی پیام
وہ ہر جگہ دیتے رہتے ہیں، جو کوئی نیا نہیں، لیکن وہ اس کو اپنی تقریر اور تحریر میں کچھ ایسے ایمانی
ولولے، قلبی درد اور داعیانہ انداز سے کہتے اور لکھتے ہیں، کہ سننے اور پڑھنے والے زبان حال سے
کہہ اٹھتے ہیں، ع : ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا،

وہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا بڑا احترام کرتے، ان کے علمی کارناموں کے بھی معترف رہے،
مگر وہ اس کے قائل نہیں کہ اسلام کو سمجھنے کا حق صرف انہی کو تھا، اس لئے اسلامی تعلیمات سے
متعلق ان کی نظری و فکری تعبیرات سے اختلاف عالمانہ اور مخلصانہ انداز میں اپنے رسالہ **عصرِ حاضر
میں دین کی تفہیم و تشریح** میں کیا، اس کا ترجمہ عربی میں بھی کیا گیا،

....

عربی میں اُن کی تازہ ترین تصنیف **السیرۃ النبویہ** ہے، اس کے لکھتے وقت شاید اُن کے ہر بُن مو سے یہ آواز نکل رہی ہو :-

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو — محمد شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

اس کے ترجمے اردو اور انگریزی میں بھی ہوئے ہیں،

مولانا کے ان علمی کمالات اور دینی خدمات کا اعتراف شاہ فیصل ایوارڈ سے ضرور کیا گیا، مگر جن کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہوں تو ع :- ہے اُن کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

اس ایوارڈ کے ساتھ اُن کو لاکھوں کی رقم بھی ملی، مگر انھوں نے اعلان کیا کہ یہ ساری رقم افغانستان کے پناہ گزینوں، مکہ معظمہ کے ادارہ تحفیظ القرآن اور مدرسہ صولتیہ میں تقسیم کر دی جائے، اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ رکھا، ع :- جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے،

ایوارڈ کے ملنے سے زیادہ وہ اپنی اس شانِ استغنا کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں، مردانِ خدا کا یہی شیوہ رہا ہے، نواب کلب علی خاں والی ریاست رامپور نے مولوی محب اللہ امروہوی کے ذریعہ سے مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کے پاس یہ پیام بھیجا کہ اگر وہ رامپور تشریف لائیں تو اُن کی خدمت میں ایک لاکھ روپے کا نذرانہ خوشی سے پیش کیا جائے گا، جب مولوی محب اللہ امروہوی یہ پیام لے کر اُن کے پاس پہونچے، تو وہ عشقِ الٰہی پر گفتگو فرما رہے تھے، نواب رامپور کی خواہش ظاہر کی گئی، تو انھوں نے فرمایا میاں لاکھ روپے پر خاک ڈالو، باتیں سنو،

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں — تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں،

پھر وہ عشقِ الٰہی ہی پر باتیں کرتے رہے،

رائے بریلی میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی رہائش گاہ کے کمرے میں ٹاٹ بچھے ہوئے ہیں، ان کو اس پر بیٹھ کر جو حقیقی سکون ملتا ہے، وہ شاہجہاں کو تخت طاؤس پر بیٹھنے میں نہ ملا ہوگا، وہ چاہتے تو اپنے ٹاٹ کو مخملیں فرش میں تبدیل کر سکتے تھے، مگر

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں — جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مقالات

مولانا شبلیؒ اور اُن کی فارسی خدمات

از۔ ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

(۲)

انصاف اور دیانت کے منافی ہوگا اگر اس سلسلے میں ہندوستان کے بڑے محقق اور مورخ مرحوم پروفیسر شیرانی کی کتاب تنقید شعر العجم کا ذکر نہ کیا جائے، یہ فاضلانہ تنقید شیرانی مرحوم کے تبحر علمی اور غیر معمولی محققانہ صلاحیت کی بین مثال ہے، لیکن ایک بڑا واضح نقص اس تنقید کا یہ ہے کہ اس میں شعر العجم کی اس عظمت کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے، جس کی وہ مستحق تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاصرانہ چشمک کی بنا پر یہ کتاب معرض وجود میں آئی، اس میں کوئی کلام نہیں کہ فاضل مصنف نے تنقید میں بڑی داد تحقیق دی ہے، اور بعض امور جو شعر العجم میں ناقص یا تشنہ رہ گئے تھے، ان کی نشاندہی کی ہے لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر امور تحقیقی وہ ہیں جو نقص مواد یا کمی مواد کا نتیجہ ہیں، مثلاً مولانا شبلی کے پیش نظر دیوان رودکی کا وہ نسخہ تھا، جس میں قطران کے بھی اشعار شامل تھے؛ اُس وقت تک قطران کا الگ دیوان متداول نہ تھا، اس بنا پر قطران کے بعض شعر رودکی کی طرف منسوب ہو گئے۔ لیکن اس غلط فہمی میں تنہا صاحبِ شعر العجم ہی نہ تھے، ایرانی نسخوں میں بھی قطران کے منظومات شامل تھے، اس لئے وہاں بھی قطران کے اشعار رودکی کی طرف منسوب ملتے ہیں، دراصل تاریخ نگار جسکو ہزاروں شاعروں کے کلام سے واسطہ پڑتا ہے اس سے ہر شاعر کے کلام کے صحیح تعین کی توقع غلط ہے انوری کے

دیوان میں تاج ریزہ کا کچھ کلام شامل ہے، اگرچہ شعر العجم میں ریزہ کے اشعار سے انوری کی خصوصیات شاعری پر استشہاد نہیں ہوا ہے، لیکن تنقید شعر العجم میں دیوان انوری میں الحاق کی ایک نہایت طویل مگر دلچسپ اور دقیع بحث شامل ہے، یہ بحث اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ دیوان انوری کے متداول نسخے کا الحاق اور ایک ہندوستانی شاعر ریزہ کے کلام کا باقاعدہ تعین ہوگیا، مگر اس بحث کا تعلق شعر العجم سے نہیں، اس بنا پر تنقید شعر العجم میں اس کا شمول نامناسب تھا، گو اپنی جگہ اس بحث کی افادیت سے انکار ممکن نہیں، یہ بحث پروفیسر شیرانی کی غیر معمولی ناقدانہ صلاحیت پر دال ہے،

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دیوان انوری کا وہ نسخہ جو پروفیسر سعید نفیسی کے اعتناء سے چند سال پہلے ایران سے شایع ہوا ہے، اس میں اب بھی الحاقی کلام موجود ہے، اور یہ بات عجیب ہے کہ نفیسی صاحب نے بعض الحاقی کلام کا تعین کرکے انوری کے دیوان سے خارج کیا، اور یہ خارج شدہ کلام سراجی خراسانی کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کا سراجی سے تعلق نہیں، یہ ریزہ کا کلام ہے، لیکن ریزہ کے دوسرے الحاقی کلام کا تعین نہ کرسکنا، واقعی قابل حیرت ہے،

میری غرض یہ ہے کہ جب ناقدانہ متن الحاق سے خالی نہ ہو تو تاریخ نگار سے اگر اشتباہ ہو تو اس میں نہ تعجب کا موقع ہے، اور نہ گرفت کی گنجایش۔

اس میں شبہہ نہیں کہ پروفیسر شیرانی کا فن تنقید شعر العجم اپنے عروج پر ہے، انھوں نے زبان و ادب کے مسائل پر بڑے تبحر علمی سے گفتگو کی ہے، لیکن یہ ساری بحثیں تنقید شعر العجم سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں، استاد شیرانی کا رسالہ "فردوسی پر چار مقالے" فن تحقیق کا شاہکار ہے، اگر وہ تنقید شعر العجم میں شامل کرلیا جاتا تو اس کے سارے اعتراضات کا رخ مولانا شبلی کی طرف ہوتا، اس لئے کہ عام روایت کے مطابق مولانا نے بھی یوسف زلیخا کو فردوسی کی ملکیت سمجھا ہے، اور "فردوسی پر چار مقالے" میں ایک مقالہ یوسف زلیخا کے اصل مصنف کے تعین پر ہے، پروفیسر نولدکے

پروفیسر براؤن اور دوسرے سیکڑوں دانشور یہی لکھتے آئے ہیں کہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف ہے، اس لیے محض مولانا شبلی ہی کیوں ہدف اعتراض ہوئے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کے انتقاد شعر کے بارے میں تنقید میں کہیں اعتراض نہیں ہوا ہے، اور اگر کوئی دوسرا شیرانی ہوتو پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران پر تنقید شعر العجم سے زیادہ ضخیم حجم کی کتاب ترتیب دے دیتا، لیکن جس طرح تنقید شعر العجم سے شعر العجم کی شہرت و مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، اسی طرح تنقید تاریخ ادبیات براؤن تاریخ ادبیات کی مقبولیت و شہرت پر کوئی خراب اثر مرتب نہ کرسکتی۔

انتقاد شعر کے علاوہ نثری ادب پاروں کی پرکھ جس طرح مولانا شبلی نے کی ہے اس سے ان کے علمی تجسس اور تنقیدی ذہن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، یہ تنقیدی مضامین مقالات شبلی میں شامل ہیں اور ان میں سے ہر مقالہ مولانا شبلی کی غیر معمولی ناقدانہ صلاحیت کا شاہد ہے، ان میں بعض مقالے فارسی ادب و تاریخ سے متعلق ہیں، مثلاً مآثر رحیمی دار المضمون، یا وہ مقالہ جو انھوں نے تزک جہانگیری پر لکھا یا گلبدن بیگم کے ہمایوں نامے پر لکھا، ذیل میں اس آخری مقالے کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جاتی ہے، جس سے علامہ کے ناقدانہ ذہن کا اندازہ ہوسکتا ہے،

ہمایوں نامہ۔ ہمایوں کی بہن اور اکبر بادشاہ کی پھوپھی گلبدن بیگم کی تصنیف ہے، اس کا تنقیدی متن لیڈی بیورج نے مرتب کرکے ۱۹۰۲ء میں لندن سے شایع کیا تھا، متن حسب ذیل امور کے ساتھ مرتب ہوا ہے،

۱۔ گلبدن بیگم کی مفصل سوانح عمری۔

۲۔ کتاب کا انگریزی ترجمہ

۳۔ ترکی الفاظ کی فرہنگ۔

۴۔ شاہی خاندان کی خواتین کی فہرست مع حالات۔

۵۔ فہرست اعلام۔

مولانا شبلی نے اپنی ناقدانہ بصیرت سے اس کتاب کے سارے اوصاف کو نہایت عمدہ انداز مین پیش کیا ہے، انھون نے اس کتاب پر حسب ذیل حیثیتوں سے نظر ڈالی ہے۔

(۱) انشا پردازی، فارسی میں سادہ او رصاف واقعہ نگاری کے عمدہ نمونے تزک جہانگیری، رقعات عالمگیری ہیں، ان میں جو سادگی اور لطافت ہے، اس کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور وقائع نعمت خان عالی ہیچ ہیں، لیکن ہمایون نامہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے، اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف انداز بیان، روزمرہ اور عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی بے اختیار دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حمیدہ بانو بیگم سے جب ہمایوں بادشاہ نے شادی کرنا چاہی تو وہ راضی نہیں ہوتی تھی، بڑی مشکلوں سے راضی ہوئی، اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"غرض تا چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود، بیگم راضی نشدند، آخر حضرت والدہ نصیحت کردند کہ آخر خود بکسی خواہی رسید، بہتر از پادشاہ کہ خواہد بود؟ بیگم گفتند۔ آری بہ کسی خواہم رسید کہ دست من بگریبان او برسد نہ آنکہ بہ کسی رسم کہ دست من میدانم بدامن او نرسد،

مولانا شبلی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اس آزادی اور بلند حوصلگی کو دیکھو کہ ایک بادشاہ ذوی الاقتدار شادی کرنا چاہتا ہے، حمیدہ بانو نہیں مانتی اور جب بادشاہ بیگم نے کہا کہ آخر کسی کے پلے تو بندھے گی تو کہتی ہے کہ ہاں اس کے بندھوں گی، جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچے، نہ اس سے کہ میرا ہاتھ

اس کے دامن تک نہ پہنچے یعنی اس سے شادی کروں گی جس سے برابری کا دعوی ہو سکے، بادشاہ کا اور میرا جوڑ کیا۔؟

انشا پردازی پر طویل بحث کے بعد ہمایوں نامے سے کچھ محاورے منتخب کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

ایستادہ دریافتن	کھڑے کھڑے ملنا
پیشواز آمدن	استقبال کو آنا
قلعی شدن	محاصرہ ہونا
طرنگی کردن	شوخی کرنا
یکدیگر را دریافتن	گلے ملنا
مقدار شدن	لمبا ہونا
پای دردن	بارجانا
آب را تنگ کردن	پانی بند کرنا وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد اسکی تاریخی و تمدنی اہمیت سے بحث کی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے

(۱) واقعات جن کو خود دیکھا ہے، لکھا ہے، جو آنکھوں کے سامنے نہیں گذرا اس کے متعلق لکھا ہے کہ فلان شخص سے سنا۔

(۲) اس کتاب سے اس عہد کی معاشرت اور زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، اس کے بعد ہندال کی شادی کا واقعہ نقل کیا ہے، اور اس سے حسب ذیل نتائج نکالے ہیں۔

لہ ایک مورخ نے اس سے استدلال کیا ہے۔ کہ حمیدہ بانو کا قد اتنا چھوٹا تھا کہ اس کا ہاتھ بادشاہ کے دامن تک نہیں پہنچتا تھا، فارسی دانی کی اس سے بہتر مثال اور کہاں ملے گی۔

(ا) عورتیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فنون سپہ گری سے واقف ہوتی تھیں. گھوڑے کی سواری بھی کرتیں، اور بعض خواتین مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں.

(ب) عورتوں میں موسیقی کا رواج تھا، خاندان کے آدمی جب مل بیٹھتے اور مجلس غیروں سے خالی ہوتی تو عورتیں گانا بھی گاتی تھیں.

(ج) عورتوں کا نہایت احترام ہوتا تھا، بابر کی بیوی ماہم بیگم جب کابل سے ہندوستان آئی تو بابر دو کوس پاپیادہ استقبال کو گیا، اور جب بیگم کی سواری سامنے آئی تو بابر کو پیدل دیکھ کر سواری سے اترنا چاہا تو بابر نے روکا، خود سواری کے ساتھ پیدل چلکر محل تک آیا.

(د) ملکی معاملات میں عورتوں سے بھی مشورہ لیا جاتا تھا.

(ہ) عورتوں کو اپنی شادی کے معاملے میں ایک حد تک آزادی تھی، حمیدہ بانو بیگم کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے.

(و) عورتیں بغیر نقاب اور برقع کے باہر نہیں نکلتی تھیں، ہمایوں نے نکاح سے قبل حمیدہ بانو بیگم کو بلایا تو بیگم نے کہا کہ آدابِ سلطنت کے لحاظ سے ایک دفعہ بادشاہ کے سلام کو جا چکی ہوں، دوبارہ جانا محرم کے سامنے جانا ہے.

اس طرح کے متعدد مباحث اس مضمون میں سامنے آئے ہیں.

مولانا شبلی فن تنقید کے علاوہ فارسی زبان کے دقیق مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، اسی کے تقاضے سے بعض مواقع پر دوستوں کے اشعار کی اصلاح بھی ہے، اور ان کی اصلاح و تنقید کبھی کبھی زبان کے دقیق مسائل پر مبنی ہوتی، ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی صاحب کو لکھتے ہیں.

"غزل کے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہوں، ہندوستان میں آنکھوں ہی محبت لیتے ہیں،

ایران میں یاد نہیں آتا، اس لئے "بچشم شوخ ما صبا ہی الفت موجزن خواہد شدن" کھٹکتا ہے، وہاں مہر و محبت کو نگاہ کے ساتھ باندھتے ہیں، جان تازہ وصل جانم الخ تازہ کی ہ کو اتنا لمبا[1] اور پورا نہیں ادا کرتے، بلکہ اس لہجے میں ادا کرتے ہیں،

ع کہ بدام آمدہ ام تازہ گرفتار مشب

دل کہ پامال و خراب الخ اس شعر کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ویرانہ انجمن ہوجائے، خراب ویرانہ کو بھی کہتے ہیں، اس لحاظ سے مقصد ادا ہوتا تھا، لیکن پامال کے لفظ نے پہلو کمزور کر دیا، صرف خراب ہوتا تو خوب ہوتا، یا یوں کر دیجئے:

ع دل کہ ویراں کردہ صد ترکتاز حسرت است،

مولانا شبلی کی فارسی شاعری

علامہ شبلی نعمانی کو ابتدا ہی سے فارسی میں شعر کہنے کا ذوق پیدا ہو چلا تھا، اور جیسا کہ خود انھوں نے تحریر فرمایا ہے، یہ ذوق اُن کے استاذ مولانا فاروق چریاکوٹی کے فیض صحبت

---

[1] اس سلسلہ میں مولانا شبلی نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، دراصل تازہ کی کا ہائے غیر ملفوظ یا ہائے مختفی ہے جو پڑھنے میں نہیں آتی، اس کا مصرف اپنے ماقبل کے فتحے کا اظہار ہوتا، لیکن ہندوستانی آواز میں وہ الف کا بدل قرار پائی، اسی وجہ سے بیسیوں ہندوستانی لفظوں اور ناموں میں اس کا مصرف ہوا ہے، (حالانکہ یہ صرف فارسی علامت تھی) جیسے راجہ، ڈرامہ، ٹانڈہ، پٹنہ، کلکتہ وغیرہ، انتہا یہ ہے کہ بعض عربی الفاظ میں الف مقصورہ کی جگہ ہائے مختفی نے لی ہے، جیسے تماشہ، معمہ وغیرہ، اورنگ زیب نے ہندی لفظوں میں فارسی ہائے مختفی کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی اور اس سلسلے میں ایک حکم جاری کیا تھا، اس سلسلے کی مفصل بحث کے لئے میرا مضمون "ہائے مختفی" "نکر و نظر"، علی گڑھ میں ملاحظہ فرمایئے،

کا نتیجہ ہے، کم عمری ہی میں انھیں دیوان مرتب کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا، ۸ فروری ۱۸۸۳ء کو مولوی عبدالسمیع کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں،

"تم دو قصیدے مانگتے ہو، دو کون؟ ایک عید کا قصیدہ، تو البتہ میں نے لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، کبھی تم کو بھیج دوں گا، میرے ہاتھ کا لکھا ہے اور صاف لکھا ہے، دوسرا میں نہیں جانتا، کیا کہئے زمانے کے موافق نہیں، ورنہ اب کی پورا قصد تھا، کہ دیوان فارسی مرتب کروں،"

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی خواہش پوری ہوئی، اسلئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی اطلاع کے بموجب اسی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں دیوان مرتب ہو کر چھپ گیا،

علی گڑھ کے قیام کا مولانا کی شاعری پر زبردست اثر ہے، علی گڑھ تحریک کے مفید اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا، ان میں سے پہلی چیز ملت کی بربادی اور زبوں حالی کا احساس تھا، مسلمانوں کی زبوں حالی ان کی اکثر نظموں کا موضوع بن گئی، اسی سال یعنی ۱۸۸۳ء میں جو عید آئی، اس موقع پر قصیدۂ عیدیہ لکھا جس میں ملت کے عشق میں خون کے آنسو بہائے ہیں، (حسن اتفاق سے یہ قصیدہ ان کے دیوان میں شامل ہے) اس کے چند اشعار یہ ہیں:-

حیف کیں شور طرب یک دو نفس بیش نماند　　چہ کند عید بدروے کہ بود صبر گداز
جمع اسلام چو باشد ہدف تیر بلا　　خود چہ کج باختن بازیان فلک عربدہ ساز
فرق نبود بحقیقت ز محرم تا عید　　آہ از فتنہ گری ہائے سپہر کج باز
شرح ایں حادثہ از شبلی دل خستہ مخواہ　　شب بود کوتہ و افسانہ دراز است دراز

مولانا کی شاعری کا یہ موڑ کالج کی ناموری بڑھانے میں بہت موثر ثابت ہوا، اس دور

میں جتنے اکابر علی گڑھ آتے، ان کو اپنی شاعری کے ذریعہ درد ملت سے آشنا کرتے، اور علی گڑھ کالج کی امداد کی طرف متوجہ کرتے، یہ کالج ان کی نظروں میں غرناطہ، بغداد اور اصفہان سے کم نہ تھا،

ابھی کالج میں آئے چند روز ہوئے کہ سالار جنگ اول کا انتقال ہو گیا، وہ کالج کے محسنین میں تھے، ان کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا، اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو،

آہ ایں چہ غم بود کہ جہانی است نوحہ گر　　آہ ایں چہ ماتم است کہ خوں شد دل و جگر
تنہا ہمیں نہ دولت و ملک است در خطر　　ہم شرع را نماند کنوں معنی دگر

سالار جنگ مرد جہاں گشت تیرہ تر
شادی ز دل رمیدہ دل زاں میدہ تر

مولانا کے مخصوص انداز سے اس مرثیہ کا رنگ پھیکا ہے، اس بنا پر دیوان سے خارج کر دیا گیا ہے،

مارچ ۱۸۸۴ء میں کالج کے ایک سرپرست خلیفہ سید محمد حسن وزیر ریاست پٹیالہ علی گڑھ تشریف لائے، اس موقع پر سید محمود کی فرمایش پر چند بند پڑھے جس سے محفل میں عجب سماں بندھ گیا، ایک بند یہ ہے؛:-

ایں دل ایں مایہ انتظار کہ بود؟　　آخر ایں مستی از خمار کہ بود
چشم شوقت بہ رہگذار کہ بود؟　　ہوس سرمۂ غبار کہ بود

ایں ببیں خانہ جلوہ گاہ کہ ہست؟
پردۂ دیدہ فرش راہ کہ ہست

۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامراء مدار المہام حیدر آباد کی تشریف آوری

کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا جس میں علی گڑھ تحریک اور کالج کے مقاصد کا بھی ذکر کیا، یہ قصیدہ بھی کلیات سے خارج ہے، چند شعر سنئے:

در جہاں چوں سخن از شوکتِ ارشاں گذرد
نام دستورِ دکن برسرِ عنواں گذرد

ایں دبستاں شل تازہ گلستانی ہست
خواجہ ابری است کہ بر طرفِ گلستاں گذرد

گذر افتادہ بما کوکبۂ جاہش را
تشنہ بنگر کہ بر چشمۂ حیواں گذرد

ابر دیدی کہ گہر ریزد و بر سرِ خاک
موکبِ خواجہ بما نیز بدیساں گذرد

۱۸۸۸ء میں نواب آسمان جاہ بہادر، وزیرِ اعظم حیدرآباد کے ورودِ علی گڑھ کے موقع پر رودکی کی زمین میں ایک قصیدہ لکھا جس کے صرف تین شعر محفوظ رہ گئے ہیں:

ہم چناں با نسیم گرمِ گفتگو
قاصد از در ناگہاں آید ہمی

افگند شور مبارکباد و بس
ایں حدیثش بر زباں آید ہمی

آسماں جاہ از سوی ملکِ دکن
جانبِ ہندوستاں آید ہمی

یہ اور اس طرح کے تمام منظومات کلیات سے نکال ڈالے گئے، دراصل مولانا کی آزاد طبیعت جو فیاضیوں کے قصے سے مزا لینے کو گدا طبعی قرار دیتی ہو، اس طرح کے اشعار کی ملکیت کی متحمل نہیں ہو سکتی، ان کا نصب العین عرفی کا یہ شعر تھا،

بیا بہ ملکِ قناعت کہ دردِ سر نکشی
ز قصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طے بستند

اب میں مولانا کے کلیات پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں، اس میں چھوٹے بڑے نو قصیدے ہیں جن میں تین چار خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں، ان میں پہلا عیدیہ ہے جس کے بارے میں شروع میں عرض ہو چکا ہے،

دوسرا قصیدہ بہت اہم ہے، اس لئے کہ اس میں رسمی ڈگر سے الگ راہ نکالنے کی سعی ملتی ہے،

مولانا خود واضح طور پر اس بات کا اعلان کرکے لکھتے ہیں،

جادۂ پیشرواں فہم دو دانم کہ خرد
اندریں شیوہ نہ با من ہمہ دارا ماند

تنگ ہمت بود آں کس کہ بہ آں تازہ کنی
ہم از آں جرعۂ باقی کہ بہ مینا ماند

نیست جز دونیِ فطرت کہ بہ بازارِ کمال
چشم دوزی بہ متاعی کہ بہ یغما ماند

داستاں چند تواں کرد ز محمود و ایاز
تا کے خود سخن از وامق و عذرا ماند

گر نسیم از شکنِ زلف کشاید گرہی
فکر را با تو صد آویزشِ بیجا ماند

شیوۂ مدح و غزل گرچہ فلاں را روشیست
مبتذل گشت ز چنداں کہ گویا ماند

ہاں و ہاں چند تواں بود بہ تقلید اسیر
وائے آں کس کہ بہ رہ سلسلہ بر پا ماند

جادۂ مغربیاں گیر کہ ایں طرزِ نوی
دلپذیر است و دل آویز و دلآرا ماند

مولانا شبلی کا ایک قصیدہ حالاتِ سفرِ روم پر ہے، اس میں نہایت مفید معلومات اکٹھا کئے گئے ہیں، یہ مولانا کی اُپج تھی کہ انھوں نے قصیدہ کو واقعات نگاری کے لئے مخصوص کر دیا، ان کا قصیدۂ کشمیر یہ بھی واقعہ نگاری کی اچھی مثال ہے، اس میں اپنے سفرِ کشمیر اور وہاں کے قیام کا حال لکھا ہے، کشمیر پر جو نظم لکھی جائے اس میں وہاں کے گل و گلزار کی تعریف ناگزیر ہے، یہ قصیدہ عمدہ تشبیہات و بلند تخیل کا نمونہ ہے، چند شعر گوش گزار کئے جا رہے ہیں،

بسکہ جوشید ز ہر سوی گل و لالہ بدشت
از گرانی ہا لمراں روی زمیں پیدا است

جادہ را خود ز بیاباں نتواں کرد تمیز
بسکہ گل صف زدہ ستر با سر وار چپ و راست

نقش بندِ چمن طبع ز تر دستیِ فیض
دست را ہم بہ گل و لالہ و شمشاد آراست

سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سر تا بن
یا قبا ایست کہ بر قامتِ شخص آید راست

راہرو راند ہر دل کہ نہد گام براہ
بسکہ ہر تو قدمش لالہ و گل در تہِ پاست

دیدۂ طفل کہ بر دامنِ مادر غلطد
جنبشِ باد بداں گونہ بر وی صحراست

سرو اگر پائے بدامن نکشد خود چہ کند　　زانکہ از جوشِ گل و لالہ چمن تنگ قباست
بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے ننہند　　در شبِ تار کسی گم نشود از رہ راست

مولانا کے کلیات میں چند ترکیب بند بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ترکیب بند سنہ ۱۹۰۷ء میں ندوۃ العلما کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا، اس سے مولانا کی طبیعت کا جوش ٹپکتا ہے، چند اشعار حاضر خدمت ہیں،

اے کہ نیرنگ سرا پردۂ عالم دیدی　　جام کیخسرو و فرخشمِ جم دیدی
گوناگوں بازیِ گردوں بہ نگہ آوردی　　پیکر آرائی ایں برشدہ طارم دیدی
مسند آرائی جم را بہ نظر آوردی　　تاجِ سلجوق و خمِ طرۂ دیلم دیدی
داستاں ہائے جہانگیریِ خسرو خواندی　　زور بازوی کمند افگنِ رستم دیدی
فرۂ افسر و دیہیم تماشا کردی　　سر برافراختنِ رایت و پرچم دیدی

لیک حالا تراز یں جملہ جہانے دگراست
کہ درو کالبدی دیگر و جانی دگراست

سنہ ۱۹۰۲ء میں امرتسر میں ندوہ کی مجلس عام میں ایک پرشور ترکیب بند پڑھا جس میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے تذکرے کے بعد قدیم تعلیم کی تنقید اور جدید تعلیم کی ضرورت بتائی ہے، اس کے ایک بند کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں،

ای کہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم　　انچہ با ہیچ نیرزد بجہاں آں داریم
ما نہ آنیم کہ دیہیمِ سکندر طلبیم　　ما نہ آنیم کہ اورنگِ سلیمان داریم
ما نہ آنیم کہ بر شیوۂ اربابِ حشم　　روے در راہ بدرِ دولت سلطاں داریم
ما نہ آنیم کہ با حاجب و درباں باشیم　　ما نہ آنیم کہ بام و در و ایواں داریم

ما نہ آنیم کہ با مسند و بالیں ارزیم　　ما نہ آنیم کہ سرداب و شبستان داریم
ما نیرزیم بداں پایہ کہ چوں محتشماں　　جامہ از قاقم و استبرق و کتاں داریم
ما نہ آنیم کہ یک شیوہ بآئین گیریم　　ما نہ آنیم کہ یک کار بہ ساماں داریم
خاکسارانِ جہانیم و از اسبابِ جہاں　　بوریائی است کہ در کلبۂ احزاں داریم
جز نے خامہ و اوراقِ پریشاں نبود　　بیش و کم آنچہ بہ پیدا و بہ پنہاں داریم

ہم بیک حال بود بی سر و سامانیِ ما
کہنہ ہرگز نشود جامۂ عریانیِ ما

مولانا کے کلیات میں چار مرثیے ہیں، جن میں وہ مرثیہ جو انہوں نے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی موت پر سنہ ۱۸۸۷ء میں لکھا ہے، زیادہ پُر درد ہے، کیوں نہ ہو عالِم کی موت عالَم کی موت ہے، چند شعر ملاحظہ فرمایئے،

دریں آشوبِ غم غدرم نہ گر نالہ زن گریم　　جہانی را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم
بہ تحسین صبوری چند بفریبی مرا ناصح　　دمی بگذار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہم نوا باشد　　ہنر بر خویشتن گرید چو من بی خویشتن گریم
دو تا غم دارم و ہر یک زدیگر حسرت افزا تر　　بمرگش گریم و آنگاہ بر مرگِ سخن گریم
گہی بنجود بہ برہم گشتنِ کارِ ہنر نالم　　گہی بی خویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم
بیکبار انجمن برہم زدی تا از میاں رفتی　　ہنر دین گرد ہیں ماتم چو شمعِ انجمن گریم

چہ در دل داشتی تا انکہ رنجیدی چرا رفتی
زما بگستہ مولائے ما آخر کجا رفتی؟

مولانا شبلی کا اصل میدان غزل ہے، اُن کی جمالیاتی حس بڑی تیز تھی، کم عمری ہی میں

اُن کی شاعری میں پختگی پیدا ہوگئی، علی گڑھ آئے تو اُن کے ذوق کو جلا ملی، اور اب وہ اساتذہ کی زمینوں میں کامیاب غزلیں لکھنے لگے، ایک واقعہ اس طرح پر ہے کہ اپریل سنہ ء میں "حیراں و فراواں" کے قافیے اور "چہ کنم" کی ردیف میں علی حزیں کی غزل پر غزل لکھی جو اس زمانے کے دو مشہور استادوں، خواجہ عزیز الدین صاحب پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی اور مرزا غالب کے شاگرد نیر دہلوی کے پاس محاکمہ کیلئے بھیجی گئی، دونوں نے تسلیم کیا کہ مولوی شبلی نے جو لکھا ہے وہ اہلِ زبان کا کلام ہے، نیرّ دہلوی نے بہت تعریف کی، اور لکھا کہ سلف کے ہم پلہ ہے اس غزل کے تین شعر باقی رہ گئے ہیں؛

گر کم عقل نہ گیرم منِ حیراں چہ کنم — می دہد منبچہ ام بادہ فراواں چہ کنم
خود گرفتم کہ بزلفش نفروشم دل و دیں — در بغارت بردآں نرگسِ فتاں چہ کنم
جائی از دستِ جنوں بہرہ من باشد دگر — از مغانش نفرستم بگریباں چہ کنم

مولانا شبلی کی غزلیں چار عنوان کے تحت ملتی ہیں، سب سے قدیم وہ ہیں جو دیوان میں شامل تھیں، بعد کی غزلیں تین عنوان کے تحت پائی جاتی ہیں، دستۂ گل، بوئے گل، اور برگِ گل، قدیم غزلوں میں بڑی قطع و برید ہوئی، یہاں تک کہ کوئی غزل کامل طور پر اب موجود نہیں، جستہ جستہ اشعار باقی رہ گئے ہیں، بلکہ اکثر کا مطلع بھی غائب ہے، دستۂ گل کی غزلیں قیامِ بمبئی کی یادگار ہیں، اس کی غزلیں اور دوسری غزلوں سے جوش و سرمستی میں بڑھ کر ہیں، خود مولانا کو اس کا احساس ہے، چنانچہ ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:-

"بوئے گل کی نسبت تمام اہلِ نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے، واقعی دونوں کے شانِ نزول مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے، ایک شعر میں خود یہ راز کھل پڑا ہے"

یا جگر کاوی آن نشتر مژگاں کم شد
یا کہ خود زخمِ مرا لذتِ آزار نماند

بہرحال مولانا حالی کی رائے "بوئے گل" کی غزلوں کے حق میں تھی، مولانا شبلی اوپر والے خط میں لکھتے ہیں:

مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں، وہ بوئے گل کو حال بتاتے ہیں، اور دستۂ گل کو قال، لیکن اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ دستۂ گل کو مولانا حالی ناپسند کرتے تھے، اُس کی غزلوں کی بابت حالی کی یہ رائے ہے،

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولینا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمارِ چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے غزلیات حافظ کا وہ حصہ جو محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں"۔

بمبئی کے قیام کا اُن کی غزل گوئی پر خاص اثر پڑا ہے، چنانچہ مولانا خود ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا، یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، اپالو یہاں عجیب سیر گاہ ہے، اور چوپاٹی اس کا جواب ہے، خواجہ حافظ کے مصرعے کو یوں بدل دیا ہے:
کنارِ آب چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را"

پوری غزل کلیات میں نقل ہے، سنئے،

نثار بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را | طراز مسند جمشید و فرِ تاجِ خسرو را

بہر سو از ہجومِ دلبرانِ شوخ بے پروا | گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہرو را

فغان از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی | بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت | کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالو را

متعدد غزلوں میں بمبئی کی یاد ملتی ہے، چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

دامنِ عیش ز دستم نرود تا شبلی | دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم

بمبئی بود مرا منزلِ مقصود عبث | پیش ازیں گام طلب در رہِ حرماں زدہ ام

زہی جاں بخشیِ آب و ہوائے بمبئی شبلی | طراز دجلہ و نوشاد و فرخارات پنداری

ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است | باش تا بادۂ ایں میکدہ در جوش آید

شبلیا آں جلوۂ تیز نگہہائے بمبئی | بود تا وقتی کہ من خواب گرانی داشتم

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی | حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم

مولانا شبلی کی غزلوں میں اچھی غزل گوئی کی جملہ خوبیاں موجود ہیں، اُن میں جوش و سرمستی، سوز و گداز، تغزل، سادگی و روانی، جدت اسلوب، بلاغت، واردات عشق سب کچھ پایا جاتا ہے، چند مثالوں سے اس کی تصدیق ہو سکے گی،

جوش و سرمستی کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

چند در پردہ تواں کرد سخن فاش بگوی | سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام

ساغری چند بہ یادِ رخِ رنگیں خوردم | قدحی چند در آغوشِ گلستاں زدہ ام

آں نگارِ عجمی چہرہ بداں ساں افروخت | کآتش اندر دم و در خرمنِ ایماں زدہ ام

جامۂ زہد چو بر قامتِ من راست نبود | شیشۂ تقوی سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

کارم افتادہ بداں پادشہِ کشورِ حسن | دست رد بر چشم قیصر و خاقاں زدہ ام

برق عشقی کہ مرا بر دل و بر تن زدہ بود | ایں ہمانست کہ بر وادیِ ایمن زدہ بود

دیدی اے دوست کہ تا دامنِ ایماں برسید | عشق آں چاک کہ در جامۂ دامن زدہ بود

شب کہ تیر نالۂ من برگ و ساماں کردہ بود | رخنہ ہا در گنبد گردون گرداں کردہ بود

سادگی و روانی کی مثال میں ایک غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

امشی نماند خلوتیانِ صبا زرا | دیدی تطاولِ خمِ زلفِ دراز را

ذوقے دگر بود بہ تماشا گہِ وصال | چشمے بخواب در شدۂ نیم باز را

لعلِ لبش اگرچہ بکامم شکر نریخت | باما سری است آں نگہ جاں نواز را

ہرگز یکے بخوبی و رعنائی تو نیست | ما دیدہ ایم کج کلہانِ طراز را

ما از بلند و پستِ جہاں در گذشتہ ایم | از بسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را

چیزے ز لطف نیز بیامیخت در ستم | تا اعتدال دادہ ستم ناز را

ناوک بزد بغیر و مرا در جگر نشست | قرباں شوم خطای نگہ ہای ناز را

ما خود نخواہم اینکہ برافتد حجابِ راز | اما چہ چارہ کلکِ حقیقت طراز را

وقوع گوئی و معاملہ بندی

عشق و ہوسناکی میں جو حالات پیش آتے ہیں، اُن کے ادا کرنے کو وقوع گوئی یا معاملہ بندی کہتے ہیں، امیر خسرو کے یہاں اس کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن متاخرین شعراء میں شہرت جہاں، ولی دشت بیاضی اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی دی، شبلی نے اس طرز کے بہت سے اشعار لکھے ہیں، چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

شرم از لبِ تو حرفِ حیا گرچہ بر نداشت | شادم بہ ایں کہ غمزۂ پرفن بکار بود

مارا بہ بوسہ ہاے شکر ریز بر نواخت — تا کس نہ گوید اینکہ طریق کرم نداشت

دین و دنیائی اگرمی داری اے دل مفت تست
یار می گوید کہ نرخ بوسہ ارزاں کردہ است

ناز غرور حسن ندادش اجازتی — ورنہ سوال بوسہ ما را جواب داد

جدتِ ادا یا بدیع اسلوبی | مولانا شبلی سیدھے سادے واقعہ کو اس لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں، کہ ان میں لطف و کیف پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً

بیدار کردہ است بہر گوشہ فتنۂ — با آنکہ چشم سحر طرازش بخواب بود

ایں ہم آخر فیضِ شب ہاے دراز ہجر بود
گر شمارِ حلقہ ہاے زلفِ پیچاں کردہ ام

ایک اور شعر میں تار زلف کے شمار کے لیے شب وصل کی درازی کی خواہش کیسے لطیف انداز میں ہوئی ہے،

شب وصلے از خدا آں درازی آرزو دارم
کہ یک یک بر شمارم حلقہ ہاے زلفِ پیچاں را

درچمن رفتی و از بہر نثار آورد باز — غنچہ رنگِ گل رنگ بوئی را کہ پنہاں کردہ بود
لعل معجز کیش او طرح مسلمانی نہاد — ورنہ چشمش رخنہ ہا در کار ایماں کردہ بود
در وصالم نیز کام دل از و حاصل نشد — بسکہ شرم خویش را بر خود نگہباں کردہ بود
وحشی دلم بہ سایۂ زلفِ دراز بود — آسودہ آنچناں کہ دگر ہیچ رم نداشت

تغزل | تغزل غزل کی جان ہے، یہ وصف شبلی کے یہاں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، اوپر کی مثالوں سے اس کا کسی قدر اندازہ ہو گیا ہوگا، مزید توضیح کے لیے ایک غزل کے

اشعار نقل کئے جاتے ہیں،

آں شوخ چوں ز پردہ بیکبار برآمد — ہنگامۂ مستوری زاہد بسر آمد
لب تشنۂ زخم است ہماں ایں دلِ بیتاب — کاں ناوک پیشین کہ زدی بر جگر آمد
ممنون سبک پائی مرگم کہ شب ہجر — از صبح دمیدن قدری پیشتر آمد
روح و قد بالا و دل افروز تو نازم — کاب دمِ شمشیر ترا تا کمر آمد
تر دستی آں غمزۂ چالاک تو ایں دید — تیرے کہ بزد تیر دگر بر اثر آمد
لب را ز تبسم نتوانست نگہ داشت — وقتے کہ ز جاں دادن شبلی خبر آمد

تشبیہات | شبلی کی غزلوں میں اکثر سادہ تشبیہات کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں، ذیل میں چند نمونے درج ہیں:

وصل کی تشبیہ مے خوشگوار سے:

ع: از بسکہ تند بود مے خوشگوار وصل

جنون کی تشبیہ غنچہ نہ شگفتہ سے:

غنچۂ نشگفتہ جنوں تا فتن آورد بہن — تا دگر از اثر بادِ بہاری چہ سود

ایمان کی دامن سے:

دیدی اے دوست کہ تا دامنِ ایماں برسید
عشق آں چاک کہ در جامۂ دامن زدہ بود

تقویٰ کی شیشہ سے:

سنگ بر شیشۂ تقوی زدہ ام ہاں نزدہ ام — شیشۂ تقوی سی سالہ بہ سنداں زدہ ام
گر نہ بر سنگ زنم شیشۂ تقوی چہ کنم — مایۂ تقوی سی سالہ فراہم شدہ است

شوق کی خمیازہ سے :-

ع : خمیازہ ہائے شوق ہماں برقرار بود

زلف کی سایہ سے اور ہجر کی شام سے :-

رفتم و در سایۂ زلفش پناہ آوردہ ام ۔۔۔ زاں ستم ہائے کہ برمن شام ہجراں کردہ بود

خرد و ہوش کی اساس سے :-

ع : یک بارہ اساس خرد و ہوش برافتاد

راز کی گنجینہ سے :

ع : فغاں کہ آں ہمہ گنجینہ ہائے راز مرا

مولانا شبلی نے با محاورہ زبان لکھی ہے، چند غزلوں سے محاورات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، "بہ بند غم شدن، بر جا شدن، می زدن، راز از پردہ بروں افتادن، طرحِ صہبائی طرح نہفتن، دم زدن، نوا زدن، گام زدن، سنگ بر شیشہ زدن، جام طرب زدن، قدح زدن، بادہ زدن، پیمانہ بر سر پیماں زدن، داستاں گردیدن، دست رد بر چیزے زدن، آتش در خرمنِ ایماں زدن، شیشہ بر سنداں زدن، نقش بر ورقِ جاں زدن، دست بہ پیماں زدن، دل زدن، طوفاں زدن، ساغر زدن، بوسہ زدن، طعنہ زدن، گرہ زدن، از مذاق افتادن، خون ریختن، حدیث از چیزے بودن، برہم گشتن، برکار بودن، بہ چیزہا ارزیدن، حرفے از چیزے بودن، تنگ در آغوش فشردن، بہ حال رسیدن، حریف دل بودن، راز گرفتن، چاک در چیزے زدن، دیدہ از چیزے باز گرفتن، پرواز گرفتن، دل گرفتن، دل دادن، نظر بر رخ کشودن وغیرہ وغیرہ،

مولانا شبلی حافظ سے متاثر تھے، اس کی ایک شکل یہ ہے کہ حافظ کے بعض مصرعوں اور

فقروں کو انھوں نے اپنی غزلوں میں شامل کیا ہے، مثلاً فرماتے ہیں :-

ناز غرور حسن نہ دادش اجازتے ۔۔۔ ورنہ سوالِ بوسۂ ما را جواب بود

پہلا مصرعہ حافظ کی اس بیت سے ماخوذ ہے :-

غرور حسن اجازت مگر نداد ای گل ۔۔۔ کہ پرسشے نکنی عندلیب شیدا را

صد چمن لالہ و گل جو شدم از جیب و بغل ۔۔۔ قرعۂ فال ہم آغوشیِ جاناں زدہ ام

قرعۂ فال کا فقرہ حافظ کی بیت سے لیا گیا ہے،

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حافظ کے معتبر نسخوں میں یعنی نسخۂ گورکھپور اور نسخۂ خلخالی وغیرہ میں قرعۂ کار ہے لیکن شہرت قرعۂ فال کی ہے، اور یہی روایت مولانا نے اختیار کی ہے،

دوش رفتیم و بدیدیم کہ طوطی بچمن ۔۔۔ داستانہا ز لب لعلِ شکر خا می کرد

"لب لعل شکر خا" کا فقرہ حافظ کی حسب ذیل بیت سے لیا گیا ہے،

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

حافظ کی مشہور بیت :

بدہ ساقی مئ باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنار آب رکنا باد و گلگشتِ مصلےٰ را

کو اپنی ایک غزل میں مولانا نے اس طرح شامل کیا ہے :

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنار آب جو پاٹی و گلگشتِ اپالو را

حافظ کی بعض غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں،

شبلی	حافظ
دوش آں دلدار با من ہم وثاق افتادہ بود	یک دو جامم دی سحر گہ اتفاق افتادہ بود
غلغلے در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود	وز لبِ ساقی شرابم در مذاق افتادہ بود
صوفی آں سرِّ حقیقت کہ ہویدا می کرد	سالہا دل طلبِ جام جم از ما می کرد
ہر حدیثے کہ بما کردہ ہم از ما می کرد	واُنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

مولانا شبلی کا نثری اسلوب نگارش

مولانا شبلی کی کوئی مستقل تصنیف فارسی نثر میں نہیں، البتہ انکے مکاتیب کے مجموعہ میں ۲۳ چھوٹے بڑے خط فارسی میں ملتے ہیں، ان کی تحریر کی خصوصیات یہ ہیں:

۱- فارسی نثر میں وہ غالب سے متاثر ہیں، اسی وجہ سے اُن کے بعض الفاظ و فقرے مولانا نے لے لئے ہیں، جیسے ہمانا، نختی، بر آن بودن، مایہ برخورداری، بادیہ پیمائی، ہرزہ درائی، ستیزۂ چرخ، آویزش بخت، آبی بر آتش زدن، چشم غمخواری، پاسخ، کشاکش غم، ہرزہ گردی از ہر جدی سخن، رفتن و دندان بدل فشردن، چہ مایہ، انصاف بالائے طاعت است، آورخ، دروغ راست مانا، ہیچ است، اندیشہ بدامنِ خاطر آویخت، کالائے راستی،

غالب کی پیروی میں ماضی تمنائی کا استعمال جیسے سخن پیوستے، درد دل گفتمی، برنخوردمی، حالانکہ زیادہ متداول صورت ماضی استمراری کا استعمال ہے یعنی سخن می پیوستم وغیرہ،

۲- خطوط کی عبارت اکثر مسجع ہوتی ہے:-

"انجمنے از یاران ساز پذیرفتہ است و ہر یکے از ہر دری سخن پیوستہ،

تن بہ رضا دادہ و دست از طلب باز داشتہ سر بفرمان نہادہ،

من گاہے خموشم و وقتے در دفع این مطاعن می کوشم،

سر بسنگ آمد و فسحت خانۂ دل از تراکم افکار تنگ آمد،

مگر از من دامنِ التفات برچیدہ اند کہ از پاسخ نامہ روی درہم کشیدہ اند،

مگر شبلی را بخت بدیار است کہ دوستی از وی بیزار است،

تاہم شما را بہ ہمگنان مزیتے باشد و ہم مدرسہ را زیب و زینتے،

۳- مولانا شبلی اپنے خطوط میں بامحاورہ زبان استعمال کرتے ہیں، چند محاورے ملاحظہ ہوں،

"تن بہ رضا دادہ، دست از طلب باز داشتید، سر بفرمان حاسدان نہادہ، بر من خردہ نتوان گرفت، روی وراہی نیست، نساختہ باشم، دلے برجای ندارم، کار بدستِ من افتد، در اندیشہ می گداختم، زمامِ اختیار بدستِ من رسید، دل با ایشاں پیوند گرفت، برخوردم، دل از دہ، بہ ہیچ دل بستم، کاسۂ آرزو بر سر شکستن، سر بسنگ آمد، دل از افکار تنگ آمد، پای در دامن کشیدم، بچیزے نرسیدم، این خود چہ حرفست، دامن التفات برچیدہ اند، روے کشیدہ اند، آبی بر آتشم زد، بجال اورسیدی، بجوی نیرزد، تن در نمی دہم، بجائے کارم نرسیدندی،

مولانا کے خطوط میں بعض خطوط ایسے ہیں جن کا اسلوب ادیبانہ ہے، مثلاً ایک خط عمِ مکرم کے نام ہے، اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں،

"غریب وحشتی روی داد و گونا گوں اندیشہ بدامن خاطر در آویختہ، ہمہ آں سخنہا کہ عزیزاں در وطن بمن میراندند بیاد آمد، دیدہ و دل را بخونابہ فشانی خواند در دیدہ می گرد و کہ انجمنے از یاراں ساز پذیرفتہ است و ہر یکے از ہر درے سخن پیوستہ تا سخن بدیں جا رسانیدند کہ بدیں مایہ برخورداری، کہ در تن گرہ داری

چونست کہ تن برضا دادہ و دست از طلب باز داشتہ سر بفرمان جاناں نہادہ،
من گاہی خموشم و وقتی در دفعِ ایں مطاعن کوشم، کہ یاران، انصاف بالا تر طاعت
است، چوں زمامِ اختیار نہ بدست من باشد، دیگر بر من خردہ نتواں گرفت"
مولوی محمد سمیع کے نام کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:-
"غریب تر حالی است، منکہ از آشفتہ سری و شوریدہ مزاجی تن بہ آمیزش کس
نمی دادم، اکنوں از فرخی طالع و ہمایونی بخت کار بجار و خس افتادہ است، مگر من
و فدائے من کہ ایں ہمہ محنت پژوہی و نفس گدازی ازاں دوست تر دارم کہ تہ ہائی
چند در ہم بافند و دروغ راست نما را چناں کہ جلوۂ ظہور و فروغ قبول دہند،
نفسی چند کہ از پیش گاہ ایزد دانا ودیعت آوردہ ام، سزائے آنست کہ سر رشتہ اش
بایں چند کارہا بند باشد، دیگراں ندانم کہ در سر چہ دارند، من خود در خیال
از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ با ایں ہمہ خواری ہا ہماں شبلی ام کہ بودہ ام
واگر گاہی بخت یاوری کرد، ہماں خواہم بود کہ ہستم"
مگر ادیبانہ طرز اور با محاورہ زبان کے باوجود کہیں کہیں اردو رنگ غالب ہے، چند مثالوں
کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:-
"بکرایہ یکہ رفت = مصرف شد، جائے قیام = جائے اقامت، دو ماہ را دو روپیہ
کرایہ = کرایہ دو ماہہ دو روپیہ،
بچنداں کفایت بسر بردہ ام = چنداں باحتیاط بسر بردہ ام، دیگر چہ گویم،
(قابل حذف) تاخیر از تمام باعث خواہد بود = تاخیر موجب آزار خواہد شد،
بخیریت ہستم، و خیر خواہ مزاج اقدس = بندہ بخیر ہستم، و امید دارم جناب عالی.

بصحت و سلامتی باشند، در قریب روزگاری = بزودی، در چند روزی مدرسہ اینجا
تعطیل خواہد یافت = پس از چند روزے در مدرسہ تعطیل خواہد شد، ایں قدر ناغہ نتواں کرد =
ایں قدر غیبت مناسب نیست، وغیرہ وغیرہ،
ان خطوط کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے نثر کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں کی ورنہ ان میں
وہ جوہر فطری طور پر موجود تھا کہ فارسی نثر میں بھی اُن کا وہی مرتبہ ہوتا جو شعر میں تھا،
مولانا شبلی نعمانی کی فارسی خدمات کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے بخوبی واضح ہے کہ بحیثیت
نقاد وہ اس حد تک کامیاب تھے، کہ نقد الشعر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بڑی حد تک
ایران میں بھی اُن کے معاصرین میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا، فارسی شاعر کی حیثیت سے وہ ایک
بلند مقام کے مالک ہیں لیکن اس میدان میں وہ اہل زبان سے بڑھ نہیں سکے ہیں
لیکن، اُن کی شاعری میں ایک فطری شاعر کا جوہر بدرجۂ اتم موجود ہے، فارسی نثر میں اُن کا درجہ
زیادہ بلند نہیں لیکن اگر اس کی طرف قرار واقعی توجہ کرتے تو وہ کامیاب نثر نویس ہوتے، اس لئے کہ ان میں
وہ فطری جوہر موجود تھا جو کسی فن میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے،

سیرت نبویؐ کی ایک اہم کتاب

الشفاء پر ایک نظر

(۲)

ضیاء الدین اصلاحی

اس تمہید سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگرچہ بشر تھے مگر قطعی دلائل اور اجماع سے ثابت ہے کہ آپ کی نوعیت عام لوگوں سے مختلف تھی، اور آپ بے شمار عوارض وآفات سے محفوظ تھے، آگے اسی مسئلہ کو واضح کیا جا رہا ہے۔

نبوت کے وقت ہی سے آپؐ کا توحید پر جزم و اعتقاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت منصبِ نبوت پر فائز کئے گئے اسی وقت سے آپ کے دل میں توحید کا عقیدہ رچ بس گیا تھا، اور آپ اللہ، اسکی ذات، اس کی حقیقت اور اس کی صفات سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے، آپ کا اللہ تعالیٰ اور وحی کی جانی والی ساری چیزوں پر ایمان نہایت پختہ ہو گیا تھا، اور ان سب امور کے بارہ میں آپ کو کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہ گیا تھا، یہ ہمارے مسلمانوں کا متفق علیہ مسئلہ ہے جو قطعی اور واضح دلائل سے بھی ثابت ہے، اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی	خداوند! مجھے دکھا کہ تو کس طرح مُردوں
قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی	کو زندہ کرے گا، اللہ نے کہا کیا تم کو
وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (بقرہ)	ایمان نہیں، حضرت ابراہیمؑ نے کہا

کیوں نہیں! لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کو اس بات میں شک وشبہہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور عدم سے وجود میں لاتا ہے، بلکہ ان کو مردوں کے زندہ کئے جانے کے عمل کے وقوع کا پورا پورا علم ویقین تھا۔ البتہ وہ اطمینان قلب چاہتے تھے، اور ان کی خواہش یہ تھی کہ مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔

یہ توجیہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو شک نہ تھا بلکہ ان کا سوال صرف یقین و اطمینان کی زیادتی کے لیے تھا، اس لئے کہ علم ضروری ونظری[1] میں قوت وزیادتی کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے، نظریات میں تو شک کا احتمال رہتا ہے، مگر ضروریات میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہوتی، پس حضرت ابراہیمؑ کو نظر وخبر کے ذریعہ جو بات معلوم ہوئی تھی اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا علم الیقین عین الیقین میں تبدیل ہو جائے، مشہور مثل ہے فلیس الخبر کالمعاینۃ یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ[2]۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے بعد انبیاء علیہم السلام کی عصمت قطعی طور پر ثابت ومسلّم ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات کسی طرح بھی درست

---

[1] نظری وہ علوم [illegible] ہیں، جو فکر ونظر کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کا علم نظری تھا جو گو یقین پر مبنی تھا، اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہ تھی تاہم نظریات میں بہرحال شک کا احتمال ہوتا ہے جبکہ ضروریات میں قطعاً نہیں ہوتا جیسے دو کا آدھا ایک یا دو متضاد چیزیں اکٹھا نہیں ہو سکتیں وغیرہ [2] مصنف نے اسکی مزید توجیہات بھی بیان کی ہیں اور متعدد دوسری آیتیں اور حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن سے اسطرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان کا مدلل جواب دیا ہے، مگر طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کر دیا گیا۔

اور یہ صحیح نہیں ہو سکتی کہ آپ جس بات کو پہچانے پر مامور کئے گئے تھے، اس کو آپ نے نہیں پہچانا یا آپ نے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی یا شرک سے آپ کا دامن آلودہ ہوا یا اللہ کے متعلق آپ نے کوئی جھوٹی بات کہی یا گڑھی یا آپ کبھی راہ راست سے بھٹک گئے یا کفار و منافقین کے کہے میں آگئے۔

نبوت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ نبوت سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام اللہ کی ذات وصفات سے واقف ہوتے ہیں، اور ان کو اس بارہ میں کسی طرح کا شک وتردد نہیں ہوتا، انبیاءؑ کے واقعات وحالات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی پیدائش ہی کے وقت سے ان نقائص سے پاک ہوتے ہیں، اور ان کی نشوونما توحید اور ایمان پر ہوتی ہے، نبوت کے بعد اُن پر انوار وبرکات الٰہی کا فیضان ہوتا ہے، کسی مورخ اور واقعہ نگار نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ کوئی ایسا شخص نبی بنایا گیا ہو، جو نبوت سے پہلے کفر وشرک میں ملوث رہا ہو۔ قریش نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر طرح کے الزام لگائے، اور گذشتہ انبیاءؑ پر بھی ان کی کافر قوموں نے ہر قسم کے اعتراضات کئے جن کی صراحت قرآن مجید نے بھی کی ہے، اور اہل سیر وتاریخ نے بھی ان کو نقل کیا ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ انبیاءؑ کو اس پر مطعون کیا گیا ہو کہ کل تک وہ جن معبودوں کی خود پیروی کر رہے تھے، آج ان کو بھلا بیٹھے، یا اس بات کے لیے ان کی مذمت کی گئی ہو کہ انھوں نے اس چیز کو ترک کر دیا، جس کو کل تک ہمارے ساتھ کیا کرتے تھے، اگر اس طرح کی بات ان نبیوں کی جانب سے ہوئی ہوتی تو کفار ضرور اس پر معترض ہوئے ہوتے اور ان کے اس اعتراض میں بڑا وزن بھی ہوتا۔ مگر جب کفار کی پوری جماعت کی جانب سے یہ اعتراض نہیں ہوا تو یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کو انکی

ذرا بھی گنجائش نہ مل سکی اگر کوئی گنجائش ملی ہوتی تو وہ خاموشی نہ اختیار کر لیتے جس طرح کہ قبلہ بدلنے کا حکم ہوا تو انھوں نے اعتراضات شروع کر دیئے تھے، اور یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ کا دامن کفر وشرک سے آلودہ ہوتا جب کہ بچپن ہی میں حضرت جبریلؑ نے آپ کا سینہ چاک کر کے اس کی آلائشیں دور کر دی تھیں، اور پھر اس کو دھو کر اسے حکمت وایمان سے بھر دیا تھا، آپ کا یہ ارشاد اوپر گذر چکا ہے، کہ مجھکو بتوں سے سخت نفرت تھی ایک دفعہ آپ اپنے چچا ابوطالب کے اصرار سے قریش کے کسی تہوار میں چلے گئے مگر وہاں سے وحشت زدہ ہو کر واپس لوٹے، آپؐ فرماتے تھے کہ جب میں کسی بت کو چھونے کا ارادہ کرتا تو ایک لمبا اور سفید شخص نمودار ہو کر میرے پیچھے آجاتا اور مجھے اس سے روک دیتا، اس کے بعد آپؐ پھر ان کے کسی میلہ اور تہوار میں نہ شریک ہوئے، اسی طرح جب آپؐ بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ شام گئے اور بحیرا راہب آپؐ سے ملا تو اس نے آپؐ کے اندر نبوت کی علامتیں دیکھیں، اس لیے امتحان کے طور پر اس نے آپ سے لات وعزیٰ کی قسم لینی چاہی مگر آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے ان دونوں سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں۔

دینی ودنیوی معاملات میں آپ کی باخبری،

جو معاملات دنیا سے متعلق ہیں، اُن میں انبیاءؑ کے لیے عصمت ضروری نہیں، اس طرح کے امور سے وہ ناواقف بھی ہو سکتے ہیں، اور ان کے بارہ میں خلاف واقعہ رائے قائم کر سکتے ہیں، اس میں کوئی نقص وعیب بھی نہیں، اس لئے کہ انبیاءؑ کا اصل مطمح نظر آخرت، اس کے حالات اور شریعت کے احکام وقوانین ہیں، اس کے برخلاف جن لوگوں کا مرکز ومحور صرف دنیا ہوتی ہے ان کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ

......يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ وہ لوگ دنیوی زندگی کے ظاہرت

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ واقف ہوتے ہیں، اور آخرت سے

الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (روم) غافل رہتے ہیں۔

مگر انبیا علیہم السلام کے بارہ میں یہ خیال صحیح نہیں کہ وہ دنیا کے امور و مسائل سے سرے سے ناواقف ہوتے ہیں، کیونکہ یہ تو غفلت اور بے خبری ہوئی جس سے وہ قطعی منزہ ہوتے ہیں، اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ ان کی بعثت دنیا والوں کی طرف ہوتی ہے اور ان کے سپرد ان کی سیاست و ہدایت اور دینی و دنیاوی معاملات کی نگرانی کی جاتی ہے، ایسی حالت میں وہ دنیوی امور سے بالکل ہی ناواقف اور بے خبر کیسے رہ سکتے تھے،

اگر دینی معاملات ہوں تو ان میں آنحضورؐ کی لاعلمی اور ناواقفیت کا خیال غلط ہے کیونکہ ان سے آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کردیا جاتا تھا، اس لئے ان امور کے بارہ میں آپ کو علم یقینی حاصل ہوجاتا تھا، البتہ جن چیزوں کے بارہ میں آپ پر وحی نہیں نازل ہوتی تھی، اور ان میں آپ اجتہاد فرماتے تھے، تو یہ اجتہاد بھی برحق اور صحیح ہوتا تھا، اس بارے میں جن لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ ناقابل التفات ہے، البتہ جن شرعی حوادث و واقعات میں آپ کوئی متعین اور قطعی بات عدم واقفیت کی بنا پر نہ کہتے تو ان میں وحی کا انتظار فرماتے اور جب وحی کے ذریعہ اللہ آپ کو ان سے مطلع فرماتا تو آپ خود واقف ہوجاتے اور دوسروں کو بھی بتادیتے۔

یہ بات کسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان نہیں ہوسکتی تھی کہ جس شریعت کی دعوت دینے کیلئے آپ بھیجے گئے تھے، اس کی تفصیلات سے واقف نہ رہے ہوں کیونکہ جس چیز سے آپ واقف ہی نہ ہوں اس کی دعوت کس طرح دیتے، اب رہا آسمان

و زمین کی ملکوت، (بادشاہی) خدا کے اسماء حسنیٰ کی تعیین، آیات کبریٰ، امور آخرت علامات قیامت، اہل سعادت و اہل شقاوت کے احوال، اور گذشتہ و آئندہ کا علم وغیرہ تو ان کے متعلق آپ صرف وحی ہی کے ذریعہ واقف ہوتے تھے، لیکن ان سب تفصیلات کے بارہ میں آپ کی واقفیت ضروری نہیں ہے، گو ان امور کا آپ کو جس قدر علم تھا وہ عام انسانوں کو نہ تھا، آپ کا ارشاد ہے،

انی لا اعلم الا ما علمنی ربی میں نہیں جانتا مگر ان ہی باتوں کو

(بیہقی) جنھیں میرے رب نے سکھایا ہے۔

اسی طرح صحیحین کی روایت میں ہے کہ خدا نے جنت میں اپنے صالح بندوں کے لیے جو نعمتیں تیار کی ہیں، ان کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے سنا ہوگا، اور نہ کسی دل میں ان کا خیال ہی گزرا ہوگا، نیز آپ نے فرمایا۔

اسئلک باسمائک الحسنیٰ جن ناموں کو تو نے مجھے بتایا اور جن کو نہیں

ما علمت منها وما لم اعلم بتایا ان سب کے ذریعہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں

خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (یوسف) ہر علم والے کے اوپر خدائے علیم کی ذات ہے،

غرض خدا کے معلومات کی حد و انتہا نہیں اور ان کا کوئی شخص احاطہ نہیں کرسکتا۔

اقوال میں نبیؐ کی عصمت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کی صداقت مسلم ہے، یہ آپ کی شان کے سراسر منافی ہے کہ آپ شریعت کی جن باتوں کو پہنچایا یا جن کے بارہ میں آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کیا گیا، اور پھر ان کی آپ نے لوگوں کو خبر دی ان میں کوئی بات خلاف واقعہ یا غلط ہوئی ہو خواہ یہ بات آپ نے خوشی کی حالت میں کہی ہو

یا ناراضگی کی حالت میں اور تندرستی کے زمانہ میں کہی ہو یا علالت کے زمانہ میں، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ میں نے کہا اے خدا کے رسول کیا جو کچھ آپ سے سنتا ہوں سب کو لکھ لوں آپ نے فرمایا ہاں، میں نے عرض کیا کیا غصہ میں بھی آپ جو کچھ فرمائیں انکو بھی لکھ لیا کروں ارشاد ہوا ہاں میری زبان سے صرف حق ہی بات نکلتی ہے۔ خدا کا بھی ارشاد ہے کہ

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ	نبی اپنی خواہش سے نہیں کہتا وہ جو کچھ
ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (نجم)	کہتا ہو اس کی اس کو وحی کیجاتی ہے

نیز فرمایا:۔

وَقَدْ جَآءَکُمُ الرَّسُوْلُ	اور تمھارے پاس تمھارے خداوند کی
بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّکُمْ	طرف سے رسول حق لیکر آیا ہے۔

اگر نبی کے لئے سہو و غلط جائز مانا جائے تو حق و باطل میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔

آگے چلکر مصنف نے اقوال کی طرح اعمال میں بھی انبیاؑ کی عصمت ثابت کی ہے، اور دکھایا ہے کہ ان سے فواحش و کبائر کا صدور نہیں ہوا، اور انھوں نے خدا کے حکم کو پہنچانے میں اخفا، کمی اور کوتاہی نہیں کی۔

دنیوی عوارض اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء بشر تھے انکے جسم اور ظاہری حالات بھی عام انسانوں جیسے تھے۔ اس لئے ان پر مختلف حالات طاری ہوتے رہتے تھے، اور وہ آفات و مصائب سے بھی دوچار ہوتے تھے، تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ بیمار ہوتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے موت کا پیالہ بھی پیا۔ جیسا کہ ہر فرد بشر کے ساتھ یہ ہوتا رہتا ہے، اور یہ کسی نقص اور عیب کی دلیل نہیں ہے، آنحضرت صلعم کا بیمار ہونا اور

بیماری کی شدت سے پریشان ہونا ثابت ہے، آپ کو گرمی اور سردی بھی لگتی تھی، اور بھوک پیاس بھی لاحق ہوتی تھی۔ غصہ بھی آتا تھا، اور آپ پر گھبراہٹ بھی طاری ہوتی تھی، آپ تکان بھی محسوس کرتے تھے، کمزوری اور بڑھاپا بھی آپ کو لاحق ہوا، گھوڑے سے گرے تو دائیں پہلو میں چوٹ آگئی، کافروں نے زخم لگایا، اور دندان مبارک شہید ہو گئے آپ کو زہر پلایا گیا، اور آپ پر جادو بھی کیا گیا، آپ نے دوائیں کیں پچھنا لگوایا، پھر انتقال فرما گئے، یہ سارے حالات عام لوگوں کو بھی پیش آتے ہیں، اور آپ کے علاوہ دوسرے انبیاءؑ کو اس سے بھی زیادہ سخت اور دشوار حالات پیش آئے، بعض قتل کر دیئے گئے بعض کو آگ میں ڈال دیا گیا، اور بعض کے جسم پر آرے چلائے گئے اور بعض کو اللہ نے ان شدائد سے بچا لیا، جس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچایا۔

یہی حال آپ کے بعض فیصلوں کا بھی تھا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری طرح آدمی ہوں، تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو ممکن ہے کوئی شخص اپنی بات زیادہ اچھے ڈھنگ سے بیان کرے اور میں اس سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں اس لئے اگر میں نے کسی کو اس کے بھائی کا حق دیدیا ہو تو وہ اس کو نہ لے کیونکہ یہ آگ کا ٹکڑا ہے،

گویا آپ کے فیصلے ظاہر حال اور غلبۂ ظن کے مطابق ہوتے تھے، آپ دو گواہوں سے شہادت اور مدعی سے قسم لے کر جس چیز کو قرین قیاس سمجھتے اس کا فیصلہ فرما دیتے، یہی اللہ کی حکمت کا تقاضا بھی تھا، وہ اگر چاہتا تو آپ کو لوگوں کے پوشیدہ معاملات اور بھیدوں سے واقف کر دیتا، اسطرح آپ براہ راست پورے علم و یقین سے فیصلہ صادر فرماتے اور کسی اقرار و ثبوت کی آپ کو ضرورت نہ ہوتی، مگر چونکہ اللہ نے امت کو آپ کی اتباع کا حکم دیا ہے،

اس لیے اگر وہ اس طرح کے معاملات میں آپؐ کو لوگوں کے اسرار اور مخفی باتوں سے آگاہ
کر دیتا تو امت کے لیے آپؐ کے اقتدا کی کوئی صورت باقی نہ رہتی، اس لیے آپ کے فیصلے
اور احکام ظاہر حال پر مبنی ہوتے تھے تاکہ ان میں آپ کو دوسروں پر کوئی امتیاز اور خصوصیت
نہ رہے۔ یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے خاص ہے، وہ
اس سے کسی کو مطلع نہیں کرتا البتہ اپنے منتخب رسولوں کو جن امور غیب کی چاہتا ہے خبر دیدیتا ہے۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیوی باتوں اور خبروں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
کبھی جھوٹ سرزد نہیں ہوا، البتہ تعریض و کنایہ آپؐ کی شان کے منافی نہیں ہے، خصوصاً ایسے
موقع پر جب کوئی مصلحت اس کی متقاضی ہو، چنانچہ لڑائیوں میں آپؐ اپنی سمت بتانے میں
توریہ سے کام لیتے تھے تاکہ دشمن چوکنا نہ ہو سکے، اسی طرح مزاح میں بھی آپؐ سے اس طرح کی باتیں منقول
ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی دلجوئی اور خوشی کے لیے کبھی کبھی مزاح بھی فرمایا کرتے
تھے، ایک دفعہ ایک صاحب نے آپؐ سے سواری کے لیے اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا کہ میں تم کو
سواری کیلئے ابن الناقہ (اونٹ کا بچہ) دوں گا، انھوں نے کہا یہ میرے کس کام کا؟ آپؐ نے فرمایا
اونٹنی ہی تو اونٹ جنتی ہے، اس لئے اونٹنی ماں اور اونٹ اس کا بچہ ہوا، اسی طرح ایک خاتون نے
آپ سے اپنے شوہر کے بارہ میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ وہی شخص ہیں جن کی آنکھ میں سفیدی ہے؟
انھوں نے کہا نہیں، ان کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، تب آپ نے فرمایا کہ ایسا کون آدمی
ہے جس کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہوتی۔

گو یہ سب تفریح اور دلچسپی کی باتیں تھیں، مگر سب درست اور صحیح تھیں، اسی لئے آپؐ نے
فرمایا کہ میں مذاق اور تفنن کرتا ہوں مگر صحیح بات ہی کہتا ہوں۔ اسی طرح دنیوی کاموں میں بھی
آپؐ گناہوں اور مکروہات سے بچتے تھے۔

کتاب الشفا اور قرآن مجید | کتاب الشفا کا ایک ماخذ قرآن مجید ہے، اس کی ابتدا میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و منقبت کے متعلق مختلف قرآنی آیتیں درج ہیں اور اس کے بعد بھی جابجا
آپ کے اوصاف و خصائص اور خصوصیات و امتیازات کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید سے ثبوت
پیش کیا گیا ہے، علامہ شبلیؒ سیرۃ النبی میں ایک باب "قرآن اور سیرت محمدیہ" کے نام سے مرتب
کرنا چاہتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اس تجویز کے خاص محرک و موید تھے، وہ رقمطراز ہیں

"لوگوں نے حیات و سیرت طیبہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر اس
حیثیت سے بہت کم نظر ڈالی ہے کہ اگر روایات و دفاتر تاریخی سے قطع نظر
کر لیا جائے اور صرف قرآن حکیم ہی کو سامنے رکھا جائے تو آپؐ کی سیرت و حیات
پر کیسی روشنی پڑتی ہے، اور جس طرح قرآن اپنی کسی بات میں اپنے غیر کا محتاج
نہیں، اسی طرح اپنے حامل و مبلغ کے وجود و حیات کے بیان میں بھی خارج کا
محتاج ہے یا نہیں؟ اصحاب سیر و محدثین کرام نے فضائل و مدائح منصوصۂ قرآنیہ
کے تو باب باندھے ہیں مثلاً قاضی عیاض نے شفا کے متعدد ابواب میں قرآن حکیم
کی آیات متعلق فضائل و مدائح جمع کی ہیں لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج
تک کبھی اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دائرۂ استناد و اخذ
محدود رکھکر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے، جس زمانے میں مولانا شبلی
نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے
اس کا خیال ہوا تھا، میں نے کہا آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک
خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے "قرآن اور سیرت محمدیہ" اور اس میں صرف
آیات قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت

اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہوسکتے ہیں" (تذکرہ البلاغ پریس کلکتہ)

علامہ شبلیؒ نے سیرت کے اس باب کی تکمیل مولانا آزاد ہی کے ذمہ کردی تھی، انھوں نے اس پر کافی مواد بھی اکٹھا کرلیا تھا مگر ان کے مسودہ کا کچھ پتہ نہیں، آیندہ جب بھی اس موضوع پر کام کیا جائے گا، کتاب الشفا سے اس میں مدد ملے گی۔

قاضی عیاض نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے جن مسائل پر گفتگو کی ہے ان کے سلسلہ میں اولاً انھوں نے کلام مجید ہی سے شواہد نقل کئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی قرآن حکیم کی عملی تفسیر اور جیتی جاگتی تصویر تھی، اس کی توضیح ان مثالوں سے ہوگی۔

۱۔ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی تھی، اس لئے آپ کے مخالفین آپ کا بال بیکا نہیں کرسکتے تھے، اور آپ اپنے دشمنوں کے ضرر اور ایذا رسانی سے محفوظ رہتے تھے، اس کا ثبوت حسب ذیل آیتیں ہیں:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ، ۶۷)	اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھیگا۔
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا	اور تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کئے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو
(طور ۴۸)	

تیسری آیت میں ہے۔

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ (زمر ۳۶)	کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں؟
إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ	ہم تمھیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لئے جو تم سے استہزا کرتے ہیں کافی ہیں
(حجر: ۹۵)	

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ خطرے کے وقت صحابہ کرام آپ کی نگرانی کیا کرتے تھے، اس پر واللہ یعصمک الخ نازل ہوئی اس کے بعد آپ نے لوگوں کو منع کردیا اور فرمایا کہ میرا رب میرا محافظ ہے

ایک دفعہ آپ ایک درخت کے نیچے استراحت فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر تلوار سونت لی اور کہا کہ آپ کو مجھ سے کون بچائے گا، ارشاد ہوا میرا اللہ، وہ کانپنے لگا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھالی مگر اس کو معاف کردیا (ج ۳ ص ۲۲۵ تا ۲۳۲)

۲۔ اللہ نے ملائکہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کی اور جنوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، متعدد صحابہ نے ملائکہ اور جنوں کو دیکھا، قرآن میں ہے۔

وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ	اور اگر پیغمبر کی ایذا رسانی پر تم دونوں باہم اعانت کروگی تو خدا اور جبریلؑ اور نیک کردار مسلمان ان کے حامی ہیں اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔
(تحریم: ۴)	

دوسری جگہ ہے:۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ	جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کرلی (اور فرمایا کہ تسلی رکھو) ہم ہزار فرشتوں سے جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے جائیں گے تمہاری مدد کریں گے۔
(انفال: ۹)	

ایک اور جگہ فرمایا:۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ	جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے

فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۝
(انفال : ۱۲)

ساتھ ہوں تم مومنوں کو تسلی دو کہ ثابت قدم رہو۔

جنوں کے سلسلہ میں فرمایا :۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ
(احقاف : ۲۹)

اور جب ہم نے جنوں میں سے کئی جن تمھاری طرف متوجہ کئے کہ قرآن سنیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں کئی بار صحابہ کرام نے ملائکہ کو دیکھا، بعض صحابہ نے حضرت جبرئیلؑ کو آدمی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام و ایمان کے بارے میں سوالات کرتے سنا حضرت ابن عباسؓ اور اسامہؓ بن زید نے آپ کے پاس جبرئیلؑ کو دحیہ کلبیؓ کی صورت میں دیکھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جنوں کو اس رات میں دیکھا جس میں آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ایمان لائے (ج ۲ ص ۲۸۲ تا ۲۸۳)

۳۔ نبی کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی مکمل اتباع و اقتدا کی جائے اور ہر حال میں آپ کے احکام کی پابندی کی جائے اور نافرمانی سے بچا جائے۔ ملاحظہ ہو

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۝
(اٰل عمران۔ ۳۱)

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمھیں دوست رکھیگا۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت و احکام کو ہر چیز یہاں تک کہ اپنی خواہشات پر بھی مقدم رکھے، اس کی دلیلیں یہ ہیں :۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ،
(حشر : ۹)

اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کرکے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔

ان لوگوں سے بغض و نفرت کی جائے جو خدا اور اس کے رسول کو مبغوض ہوں اور جو لوگ آپ کی سنت کے مخالف اور دین میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے ہوں ان سے کنارہ کش رہا جائے، خدا کا ارشاد ہے

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (مجادلہ۔ ۲۲)

جو لوگ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

کتاب الشفا میں جو قرآنی آیتیں نقل کی گئی ہیں ان کی مختلف پہلوؤں سے تشریح کی گئی ہے، جیسے اختلافِ قراءت کا ذکر، خطاب کی تعیین، مشکل لفظوں کی وضاحت، دقیق مباحث کی تشریح، آیات کی تاویل و توجیہ اور ان کے مفہوم و مطلب کی وضاحت وغیرہ، آیتوں کی تفسیر میں ان باتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے :۔

۱۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے، کیونکہ اس میں جو چیز ایک جگہ مجمل بیان ہوئی ہے، وہی دوسری جگہ

مفصل بیان کی گئی ہے۔

۲۔ احادیث سے، ۳۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اقوال سے، ۴۔ ائمۂ تفسیر کے اقوال سے مُصنف مختار طریقہ کے مطابق سلف کے اقوال پر اعتماد کرتے ہیں، اور عموماً جمہور کے نقطۂ نظر کو مرجح قرار دیتے ہیں، تاہم ضعیف اور مرجوح اقوال کی نشاندہی اور غلط تفسیری اقوال کی تردید بھی کرتے ہیں اس طرح اس میں بکثرت تفسیری اقوال درج ہیں، کہیں کہیں آیات پر وارد ہونے والے اشکالات و شبہات کا جواب بھی دیا ہے۔ (باقی)

مولانا سیّد محمد شاہ نقوی محدّث رام پوری

از

جناب سید بہاء الحق صاحب رضوی ایم۔ اے۔ علیگ

مولانا سید محمد شاہ نقوی محدث رام پوریؒ ابن مولانا سید حسن شاہ صاحبؒ محدث ابن سید شاہ حسین ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں رام پور میں محلہ زینہ عنایت خاں میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب بخارا کے مشہور بزرگ حضرت سیدنا شاہ جلال بخاریؒ سے ملتا ہے، آپ کے جد امجد ہندوستان تشریف لائے اور رام پور میں آباد ہوئے،

ان کا تذکرہ نزہۃ الخواطر[1] میں مولانا سید عبدالحئی نے ان الفاظ میں کیا ہے،

احد کبار العلماء .... وھو	وہ بڑے علماء میں سے تھے ....
منور الشبیہ حسن الاخلاق	... وہ خوبصورت شکل وصورت کے،
حلو الکلام قد غشیہ نور	اخلاق کے بہت اچھے، ان کے کلام میں شیرینی
الایمان وسیماء الصالحین (انتھی)	اُن میں نور ایمانی کا غلبہ تھا، صالحین
الیہ الورع وحسن السمت و	کی نشانیاں پائی جاتی تھیں، پرہیزگاری
التواضع والاشتغال بخاصۃ	انتہائی درجہ کی تھی، عمدہ طریق کار،
النفس والتفق الناس علی	تواضع وانکساری اور احتساب نفس
الثناء علیہ والمدح لشمائلہ،	کی خوبیاں اُن میں موجود تھیں، لوگ

[1] نزہۃ الخواطر از مولانا عبدالحئی صاحب، جلد (۸) صفحہ ۴۳۳ - ۴۳۴۔

ان کی بزرگی اور حسن عادات کی وجہ

سے ان کی تعریف میں متفق تھے،

حکیم مولانا سید عبدالحئیؒ نے آپ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میاں صاحب نے سند حدیث بروایت شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی بذات خود عطا کی،

ان کے والد مولوی سید حسن شاہ ایک مشہور و معروف محدث تھے، ان کا تذکرہ نزہۃ الخواطر میں ان الفاظ میں ہے،[1]

الشیخ العالم المحدث حسن شاہ	مولوی سید حسن شاہ ابن شاہ حسینی حنفی
ابن سید شاہ الحسینی الحنفی	علم حدیث کے ایک مشہور عالم تھے...
الرامفوری احد العلماء المشہورین	..........سید حسن
بالحدیث..........	شاہ سادات کرام کے ایک معزز
... وکان من خیار السادۃ النبلاء	خاندان کے فرد تھے، اور بزرگی کی
الفضلاء القادۃ له من محاسن	وجہ سے عظیم رہنما کا مرتبہ رکھتے تھے،
الاخلاق ومکارم الصفات	حسن اخلاق اور عمدہ صفات کے
لیس لغیرہ مع عقل رصین و	ساتھ ساتھ عقل و فہم کی پختگی، اور دین
دین متین واشتغال بخاصۃ	محکم رکھتے تھے جس کی مثالیں کم ملتی
النفس وعفاف وعزۃ نفس	ہیں، چالیس سال تک لوگوں کو
وجلالۃ فی القلوب وفخامۃ زائدۃ	فائدہ پہنچایا، اور ان سے ان کے
عند جمیع الناس درس وافاد	صاحبزادے سید محمد شاہ اور علماء کی
ببلدہ اربعین سنۃ اخذ عنه ولدہ	بڑی جماعت نے علم حاصل کیا۔

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۱۰۸۔

السید محمد شاہ خلق کثیر من العلماء	ان کا وصال ۲۲ صفر ۱۳۱۲ھ
توفی ثمان بقین من صفر سنۃ	میں رام پور میں ہوا۔
اثنتی عشرۃ و ثلث مائۃ والف	
ببلدۃ رامفور۔	

مولانا سید حسن شاہؒ حضرت شاہ عالم علی نگینوی محدث (مرادآبادی) کے شاگرد رشید تھے، اور شاہ عالم علی صاحب حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ محدث دہلوی کے شاگرد خاص تھے، تراجم علمائے حدیث[1] مولفہ مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی نے غلط طور پر سید حسن شاہ صاحب کو شاہ اسحٰق صاحب کا شاگرد لکھ دیا ہے، حالانکہ وہ شاہ عالم علی صاحب نگینوی کے شاگرد تھے،

مؤلف تراجم علمائے حدیث کے پیش نظر تذکرہ کاملان رام پور تھا،[2] جس میں تلمذ کا سلسلہ درج ہے، غالباً اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ جب سید حسن شاہ صاحب کو حدیث کی تکمیل کا شوق ہوا تو یہ تردد ہوا کہ حضرت شاہ اسحٰقؒ سے دہلی جاکر تحصیل علم کریں یا مرادآباد میں شاہ عالم علیؒ سے، اسی تردد کے دوران خواب میں حضرت نبی علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور اس کے بعد طبیعت میں یکسوئی پیدا ہوگئی اور حضرت شاہ عالم علیؒ سے مرادآباد میں چھ سال رہ کر حدیث شریف کی تکمیل کی اور سند حاصل کی،

مولانا محمد شاہؒ نے ابتدائی تعلیم گھر پر شروع کی اور اپنے والد صاحب سے صرف ونحو کی مروجہ کتابیں پڑھیں اور ان سے ہی فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مینابازار، اور ظہوری فارسی کے مشہور عالم شیخ احمد علی صاحب سے پڑھیں،

[1] تراجم علمائے حدیث جلد اول، مؤلفہ ابویحییٰ امام خان نوشہروی، ص، ۵۰۴ - ۵۰۶ [2] تذکرہ کاملان رام پور، مولفہ احمد علی خاں شوق، ص، ۳۵۔

فقہ کی جملہ کتابیں اور اصول فقہ کی چند کتابیں اپنے والد سے پڑھیں اور بقیہ کتابیں اصول فقہ کے استاد زمانہ مولوی عزیز اللہ خاںؒ ولایتی سے پڑھیں اور معقولات کی تحصیل مولوی معظم شاہؒ ولایتی (شاگرد مفتی سعد اللہؒ) سے کی۔

خواب وہ علوم متداولہ کی تحصیل کر چکے تھے۔ لیکن حدیث شریف کی باقاعدہ تعلیم شروع نہیں کی تھی کہ ایک روز خواب میں دیکھا کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر خرمہ کا ایک درخت ہے، جس سے توڑ کر خرمے کھا رہے ہیں، غیب سے آواز آئی کہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے درخت سے خرمے کھا رہے ہو، جس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے مراد حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کا خاندان اور خرمے کے درخت سے اپنے والد ماجد اور خرمہ سے مراد علم حدیث، اس خواب کے بعد آپ کو علم حدیث کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا، مشکوٰۃ شریف، صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور دوسری کتب حدیث نہایت محنت دکاوش سے والد صاحب سے پڑھیں اور تفسیر کی کتب بھی اپنے والد سے پڑھیں اور مسلم شریف اپنے والد کے شیخ حضرت شاہ عالم علی صاحب سے پڑھی اور اس کے بعد درس دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

قیام بنارس جس زمانہ میں نواب محمد علی خاں معزولی کی حالت میں بنارس میں مقیم تھے، نواب صاحب کے قریب کی مسجد میں محمد شاہ صاحب کا قیام تھا، نواب صاحب نے اپنے لڑکے عبد الوہاب خاں کو حدیث پڑھانے کے لئے کہا، شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر عبد الوہاب خاں کو پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے، نواب صاحب بھی مسجد میں لڑکے کو تعلیم دلوانے پر رضامند ہو گئے، انھوں نے ان کو حصن حصین، مشکوٰۃ شریف اور شمائل ترمذی پڑھائیں، بنارس سے گھر آئے اور خواب میں دیکھا کہ سید معصوم صاحب کی مسجد کے بالاخانہ پر جو ضلع مالدہ بنگال میں ہے، شاہ عبد العزیز صاحبؒ حدیث شریف کا درس دے رہے ہیں، سید صاحب نے عرض کیا کہ نواب صاحب کے لڑکے کو پڑھانے بنارس جاتا ہوں، یہ امر

مجھ پر شاق ہے آپ دعا فرمائیے کہ میں گھر پر درس دیا کروں، شاہ صاحب نے فرمایا "اچھا" اور دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے، اس کے بعد وہ بنارس نہیں گئے، اور گھر پر درس دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد مولوی عبد الحق صاحب خیر آبادی کی تحریک پر ان کا تعلق مدرسہ عالیہ رام پور سے ہو گیا اور مدرسہ میں حدیث کے طلبہ کو درس دینے لگے۔ نواب خلد آشیاں کے بعد مدرسہ میں انگریزی افسران کی آمد شروع ہو گئی، جو معائنہ کے لئے آتے، وہ درس کے دوران نہ خود تعظیم کرتے، اور نہ طلبہ کو تعظیم کرنے دیتے۔ اس وجہ سے مدرسہ کی خدمت سے علٰحدہ کر دیئے گئے، اور ریاست کی جانب سے گھر پر تعلیم دینے کے لئے کہا گیا، اور مدرسہ کی تنخواہ مقرر کر دی گئی اور طلبہ کے وظیفے مدرسہ کی طرح مقرر کئے گئے، جس کو انھوں نے ریاست کی جانب سے مجبور کرنے پر قبول کر لیا، اس کے بعد ان کے درس کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبہ آتے اور سیراب ہو کر جاتے اور آخر دم تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، تقریباً پچاس سال تک گھر پر بیٹھ کر علم حدیث کی شمع کو روشن رکھا، ہندوستان اور بیرون ہند سے طلبہ پروانہ وار آتے اور روشنی حاصل کر کے واپس جاتے، ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے،

ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ اُن کے شاگرد گئے، جنھوں نے شمع حدیث کو روشن کیا، ان کی زندگی میں ان کے بہت سے شاگردوں کی بھی شہرت کافی ہو چکی تھی، اور بطور محدث اور عالم مشہور ہو گئے تھے، ان کے شاگردوں میں شمس العلماء مولوی منور علی رام پوری کی شہرت بہت زائد ہوئی، مولوی منور علی نے سید صاحب سے حدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی، وہ مدرسہ عالیہ رام پور میں درجۂ حدیث کے استاد مقرر ہوئے، اور ان کے کثیر شاگرد ہوئے، ان کا طریقہ تھا کہ مدرسہ عالیہ میں جب تعلیمی سال شروع ہوتا اور درجۂ حدیث میں طلبہ داخل ہوتے تو

پہلے سبق کے لئے طلبہ کو سید صاحب کے مکان پر لیجاتے اور خود طلبہ کی صف میں بیٹھ کر اپنے استاد سے طلبہ کو حدیث شریف شروع کراتے اور اس کے دوسرے روز سے مدرسۂ عالیہ میں سبق کا سلسلہ شروع ہوتا۔

مولوی منور علی شاگرد مولانا سید محمد شاہؒ کا تذکرہ بھی مولانا عبدالحئیؒ نے "نزہۃ الخواطر" جلد ۸ صفحہ ۴۸۳ پر ان الفاظ میں کیا ہے،

"الشیخ العالم المحدث منور علی بن مظہر الحق الحنفی الرامپوری احد العلماء المشہورین"

وفات ۱۳۵۱ھ تاریخ وفات

"مرقد آفتاب حدیث" (تاریخ وفات ۱۴؍ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ)

سید صاحب کے دوسرے اہم شاگرد حافظ محمد وزیر محدث تھے، سید صاحب حافظ وزیر کو بہت چاہتے تھے اور اکثر طلبہ کو حدیث اور دیگر علوم کے حصول کے لئے حافظ محمد وزیر کے پاس بھیجتے تھے، اور ان کو کسی طرح بھی مولوی منور علی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالواحد صواتی، مولوی محمد امین صاحبزادہ الطاف علی خاں، مولوی عبدالغفور صواتی (جو بیس سال تک ڈابھیل میں درس حدیث دیتے رہے) مولانا حافظ عبدالوہاب خاں، مولوی نجم الغنی اور خود آپ کے فرزند مولانا سید حامد شاہ (قاضی شہر رامپور) شہرت و عظمت کے مالک ہوئے۔

ان کے شاگردوں میں مولوی منور علی، حافظ محمد وزیر، حافظ عبدالوہاب خاں نے مدرسۂ عالیہ میں حدیث شریف اور دوسرے علوم کے درس دئے، مولوی منور علی کو انھوں نے اپنی زندگی میں رامپور سے باہر جانے نہیں دیا، حالانکہ اکثر مقامات سے ان کو بلایا گیا، سید صاحب کے انتقال کے بعد مولوی منور علی ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور حدیث کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

ان کے صاحبزادہ مولوی سید حامد شاہ صاحب محدث شہر رامپور کے قاضی ہوئے، اور عرصہ دراز تک اپنے مدرسہ عزیزیہ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ (انتقال یکم صفر ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء)

ان کے شاگرد عبدالوہاب خان کافی شہرت کے مالک ہوئے، اور مشہور مدرس ہوئے، سید صاحب کی زندگی میں آخر وقت تک بطور طالب علم حاضر ہوتے اور مسند امام احمد بن حنبلؒ سبقاً سبقاً سناتے،

نزہۃ الخواطر میں مولانا عبدالوہاب کا تذکرہ صفحہ ۳۱۸ پر ان الفاظ میں ہے۔

"الشیخ الصالح عبد الوهاب بن محمد عمر خان الحنفی الرامپوری احد العلماء الصالحین وكان عالماً من اهل الكثير القناعة آمراً بالمعروف ناهيا عن الشرك والبدعة ملازماً القيام الليل فی جماعة فی مسجد محافظاً على الصلوات فی اول وقتها۔" (وفات ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء)

مولانا سید حامد شاہ صاحب اکثر کلکتہ تشریف لے جاتے تھے، اور کلکتہ کے فارغ التحصیل طلبہ نے سید صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان سے عرض کیا کہ آپ دوران قیام کلکتہ حدیث شریف کا سبق دیا کریں، سید صاحب راضی ہو گئے اور ترمذی شریف کا درس شروع ہو گیا، مولانا ابوالکلام آزاد بھی اس درس میں شریک ہوئے، اور اس طرح مولانا آزاد کو بھی سید صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا، مولانا آزاد کا تأثر ان کے ہی الفاظ میں سنئے[1]:

"اس زمانہ میں اگرچہ سرسید کی تصانیف کے مطالعہ کی وجہ سے میرے دماغ میں ایک نیا طوفان اٹھ چکا تھا، اور علماء کی جانب سے طبیعت میں بدظنی اور انکار پیدا ہو چکا تھا، مجھ پر مولوی محمد شاہ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا، ان کی بزرگانہ صورت، بڑا ہی نرم و متین

[1] امام الہند (تعمیر افکار) مولانا ابوسلمان الہندی، ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔

لہجہ اور پُرمحبت تخاطب اور صاف صاف سیدھی سیدھی باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں، میں نے دیکھا اسوقت پڑھا رہے تھے اور کسی حدیث کے سلسلے میں سورۂ والعصر کی تفسیر بیان کر رہے تھے، اور یہ کہہ رہے تھے کہ جو اساسی عقائد ہیں ان کے تحفظ کے بعد کسی کی تکفیر نہیں کی جاسکتی ہے،"

مولانا آزاد دوسری جگہ فرماتے ہیں،۔

"مجھے ان کی سیدھی سادی باتیں اور بے لاگ طریق بیان اور مولوی نذیر الحسن کی تھکا دینے والی لسانیوں کے مقابلہ میں بڑی دھیمی اور نرم باتیں اتنی اچھی معلوم ہوئیں کہ میں چپکے سے دوسرے روز گیا اور کہا کہ جتنے دن آپ کا قیام ہو مجھے ایک گھنٹہ دیجئے، میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، مجھ کو بالکل ایک کمسن لڑکا دیکھ کر ان کو بہت تامل ہوا، لیکن کچھ تو والد مرحوم کا نام سن کر اور کچھ تھوڑی دیر گفتگو سے اندازہ کر کے پوری خوشی ظاہر کی اور مجھ سے کہا کہ ترمذی شریف ہی میں شریک ہو جاؤ، چنانچہ میں تقریباً دو مہینہ تک پڑھتا رہا،"[1]

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق ان کا درس بہت سادہ اور محدود تھا اور اُن سے استفادہ کی مدت بھی صرف دو ماہ تھی، لیکن یہ سادہ اور محدود درس اور چند دن کی صحبت بھی بے اثر نہیں[2] کہی جاسکتی اور جتنا اثر مولانا نے چند دن کی صحبت سے لیا، دوسرے اساتذہ کی طویل اور برسوں کی صحبت سے بھی نہیں لیا،

شاہ صاحب حنفی المذہب تھے اور بقول مولانا آزاد خلافیات حنفیہ کے ثابت کرنے پر زور دیتے تھے،

[1] امام الہند (تعمیر افکار) مولانا ابو سلمان الہندی، ص ۱۲۸ - ۱۲۹، [2] امام الہند (تعمیر افکار) مولانا ابو سلمان الہندی، ص ۱۲۹۔

مولانا کو تصوف سے لگاؤ تھا، سلسلۂ قادریہ میں اپنے والد ماجد مولانا سید حسن شاہ سے اور سلسلۂ نقشبندیہ میں شیخ کرامت علی جونپوری سے بیعت تھے اور ایک زمانہ تک موصوف کی صحبت میں رہے،[1]

دلائل الخیرات کی اجازت شیخ عبد السلام بدایونی (والد مولوی شمس الاسلام بدایونی) سے حاصل کی، قصیدہ بردہ، حرز یمانی، اسمائے اہل بدر، اور حزب البحر اپنے والد کو سنائے اور اجازت حاصل کی، سفر و حضر میں اپنے والد کی خدمت میں حاضر رہے، انھوں نے بہت سفر کئے اور جس مقام پر جاتے، وہاں کے اہل اللہ کے مزارات پر جاتے اور فاتحہ پڑھتے، اجمیر، دہلی، آگرہ، کرنال، گنگوہ، جون پور، گلبرگہ دکن، بنگلور اور دیگر مقامات کے متعدد سفر کئے، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شریک ہوئے اور بعض جلسوں کی صدارت کی،[2]

مدرسہ عزیزیہ: شاہ صاحب نے بہ یادگار حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ ایک مدرسہ عزیزیہ .... سنہ ۱۳۲۴ھ میں قائم فرمایا اور اپنے شاگرد رشید اور اپنے فرزند سید حامد شاہ صاحب جو قاضی شہر بھی تھے کو مدرسہ میں حدیث شریف کا درس دینے کے لئے مقرر کیا، اور دیگر علماء اور اپنے شاگردوں کو مختلف علوم کی تعلیم کے لئے مقرر کیا، شاہ صاحب کے پوتے سید احمد شاہ صاحب اپنے والد کے انتقال کے بعد قاضی شہر ہوئے اور اہم علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ میں حدیث شریف کے مدرس رہے اور عرصہ تک مدرسہ عالیہ میں درس دیتے رہے، وہ شاہ صاحب کے خاندان کے چوتھے محدث ہیں، سید حامد شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ حاجی سید محمود شاہ مہتمم مدرسہ عزیزیہ ہیں، مدرسہ مذکور شاہ صاحب کے مکان کے برابر ایک بلند عمارت میں قائم ہے، بزرگوں کی یاد

[1] تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۳۵۷، نزہۃ الخواطر، ص ۴۳۳، تراجم علمائے حدیث، ص ۱۲۸، ۱۲۹، [2] تذکرۂ کاملان رام پور، ص ۳۵۷۔

میں حدیث شریف کا ایک اہم مدرسہ ہے اور مولوی محمد اسلم خان حدیث شریف کا درس دیتے ہیں،

کتب خانہ[1] قیام مدرسہ کے علاوہ شاہ صاحب نے ایک اہم کتب خانہ قائم فرمایا جو بفضلہ آج بھی قائم ہے، کتب خانۂ مذکور میں تفسیر، فقہ، اصول فقہ اور کلام وغیرہ کی منتخب اور نادر کتابیں جمع کی گئی تھیں، جو آج بھی اہمیت اور عظمت رکھتی ہیں،

تصانیف شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک "بحر العلم شرح عین العلم" ہے جو ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں طبع ہوئی اور ۶۸۰ صفحہ کی کتاب ہے، دوسری والعصر کی تفسیر ہے جو طبع ہو چکی ہے اور اب نادر ہے، اس کے علاوہ چند رسائل تصنیف فرمائے جو طبع نہ ہو سکے،

مسلک شاہ صاحب مذہباً حنفی تھے، لیکن محدثانہ انداز کے ساتھ کسی فرقہ کو برا کہنا یا برا سمجھنا اُن کے یہاں بالکل نہ تھا، اختلافی مسائل میں تشدد کو بہت برا جانتے تھے، ان کے مسلک کے اعتدال اور معقولیت کی وجہ سے بہت سے علماء اور مشائخ مداح تھے اور عقیدت رکھتے تھے، لیکن ان کے اعتدال کی وجہ سے ہر قسم کے انتہاپسند مغائرت رکھتے تھے، اس سلسلے میں دو لطیفے تذکرہ کے لائق ہیں، شہر کے بعض متشدد مولوی اپنے مسلک سے اختلاف رکھنے والوں سے سلام علیک بھی نہ کرتے، ایک مرتبہ شہر کے ایک متشدد مولوی شاہ صاحب کے قریب سے گزرے، لیکن سلام علیک نہیں کی، بلکہ شاہ صاحب نے سلام علیک کی اور مزاج پرسی کی جس کا مولوی صاحب نے کوئی جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا، مولانا عبد الواحد صاحب جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے، ان کو اور دوسرے شاگردوں کو جو اس وقت موجود تھے، ناگوار گذرا اور استاد کے احترام کو مجروح ہوتے دیکھ کر رنج اور غصہ کی کیفیت کے ساتھ شاہ صاحب سے کہا کہ ایسے لوگوں کو کیوں سلام کرتے ہیں، اور ان مولوی صاحب کو بھی خشمگیں نظر دال

[1] کتب خانہ مذکور کا تذکرہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "پرانے چراغ" کے ص، ۲۷۹، ۲۹۰ پر فرمایا ہے، اور تذکرہ مذکور ہی اس مضمون کا محرک ہوا۔

سے دیکھا، شاہ صاحب نے شاگردوں کو روکا اور کہا کہ وہ سنت کو ترک کرتے ہیں تو ہم کیوں ترک کریں وہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں تو ہم ان کی وجہ سے اپنا نقصان کیوں کریں اور سنت کے ترک کے مرتکب ہوں،

دوسرا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک متشدد غیر مقلد رام پور کے اسٹیشن پر اترے اور انھوں نے کسی غیر مقلد کا مکان معلوم کیا، کسی صاحب نے زینہ عنایت خان پر مولوی محمد شاہ صاحب کا مکان بتادیا، وہ صاحب زینہ عنایت خان پہنچے اور اس مسجد میں گئے جس میں شاہ صاحب درس دے رہے تھے، انھوں نے نہایت اخلاص اور عقیدت سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گئے اور سبق ہو رہا تھا وہ سننے لگے، تھوڑی دیر میں یہ اندازہ کر کے کہ یہ تو حنفی ہیں، ادھر اُدھر دیکھنے لگے، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی ڈھونڈھ رہے ہیں، شاہ صاحب نے کسی شاگرد سے کہا کہ جاؤ اور مولوی صاحب کے ہاتھ دھلوادو، اور معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے، مولوی صاحب یہی کہہ کر چلے گئے کہ مجھے تو پتہ چلا کہ آپ کوئی غیر مقلد بزرگ ہیں۔

اس قسم کے واقعات کے علاوہ بھی بہت سے واقعات ایسے ہیں، جن سے شاہ صاحب کے حلم، بردباری اور رواداری کا پتہ چلتا ہے، موصوف غیبت کو بھی نہایت ناپسند کرتے تھے، لوگ امتحاناً ایسے لوگوں کا تذکرہ ان کی مجلس میں کرتے تھے، جن کی شہرت خراب ہوتی تھی، اور شاہ صاحب ان کی کوئی نہ کوئی خاندانی خوبی، شرافت نسبی، حسن ظاہری یا بہادری کا تذکرہ فرما دیتے اور گفتگو کا سلسلہ کسی دوسرے موضوع کی طرف موڑ دیتے،

انتقال ۲۲ شعبان ۱۳۴۸ھ بروز بدھ مطابق ۱۲ مئی ۱۹۳۰ء کو عرصۂ دراز تک علم حدیث کی خدمت کرنے کے بعد ایک بڑی تعداد کو شاگرد، عقیدت مند اور مداح چھوڑ کر رخصت ہو گئے، مزار حضرت شاہ بغدادی صاحب کے چبوترے پر دفن ہوئے، حضرت جلیل مانک پوری نے تاریخ وفات کہی ہے،

ثبت بر لوح مزارش کن جلیل　　وارث دین رسولِ دوسرا

ڈاکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی

کے

مکتوب پر تبصرہ

از

جناب آغا رشید مرزا صاحب کلکتہ

۷ر جنوری ۱۹۸۰ء مکرمی و محترمی جناب صباح الدین صاحب السلام علیکم

نومبر کے شمارہ "معارف" میں محترم ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب کا "مکتوب مکہ" پڑھا، خط دلچسپ اور انداز تحریر دلپذیر ہے، اس پر کچھ اظہار خیال اور اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں

حافظ کے شعر

شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

پر غالب کا بے جا اعتراض کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے بہت سے شعرا حافظ کے خوشہ چین ہیں، ان میں کچھ خوشہ چین بھی ہیں اور نکتہ چین بھی، حافظ اس شعر میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کی ساری اہمیت دوسرے مصرع میں ہی ہے، پہلے مصرع میں جو اظہار بے بسی ہے، اس کو یہاں دوسرے مصرع میں وسیع کرنے سے بات کچھ اور ہی ہو جاتی اور شاعر کا وہ نقطۂ خیال اور اس کا حسن جو اس نے سبکساران ساحل پر طنز سے پیدا کیا ہے ختم ہو جاتا، ہر شاعر اپنے جذبات کا اظہار اپنے احساسات اپنے تخیل اور اپنی فکر کے مطابق کرتا ہے، اس پر کسی معترض یا مبصر کا اپنے فکر و خیال کا تھوپنا بے معنی سی بات ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب مزید آگے فرماتے ہیں،

"چنانچہ غالب نے عرفی کی زمین میں جو غزل کہی ہے، عصا خفتہ است جفا خفتہ است اس میں ایک شعر حافظ ہی کے مفہوم کو وسیع کر کے کہا ہے۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

سوال یہ ہے کہ جب اس درجہ ہولناک صورت حال ہو تو اس وقت ناخدا کو نیند کیونکر آسکتی ہے، یہ وقت تو وہ ہے کہ وہ اور چوکنا ہو اور آخری تدبیر اپنی کشتی کو بچانے کی کر ڈالے، نہ کہ پڑا سوتا رہے، یہ اور بات ہے کہ وہ غالب کے ساتھ اولڈ ٹائم یا کاٹن کی بوتلیں چڑھا کر نشہ میں مردہ کے مانند پڑا ہو، مگر اس صورت میں خفتہ است کے بجائے مردہ است ہونا چاہئے تھا۔"

پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ یہاں غالب پر اس طنز سے (خطا کے ادبی رنگ کو کچھ بے رنگ کر دیتا ہے، اور معیار تحریر میں بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کی نظر میں غالب کا کردار گر جاتا ہے اور وہ مرتبہ قائم نہیں رہتا جو انھیں شیخ عبدالقادر "مدیر مخزن" نے "بانگ درا" کے دیباچہ میں دیا ہے، شیخ صاحب فرماتے ہیں،

"غالب اور اقبال میں بہت سی مشترک باتیں ہیں، اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اردو و فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا، اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

جہاں تک غالب کے شعر کے معنی کا تعلق ہے، غالب کہتے ہیں، رات تاریک تھی، ہوا مخالف تھی، بحر طوفان

خیز ہے، کشتی کا لنگر ٹوٹا ہوا ہے اور ناخدا سویا ہوا ہے، اب سوال یہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جب صورتِ حال اس درجہ ہولناک ہو تو اُس وقت ناخدا کو نیند کیوں کر آسکتی ہے؟ میں عرض کروں گا ایسی صورت میں ناخدا کا سوتے رہنا کوئی بعید از قیاس یا غیر فطری عمل نہیں، مثل مشہور ہے اور محاورہ بندی بھی ہے کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صرف محاورہ بندی اور وہ نری شاعری ہے، حقیقت دونوں میں نہیں، لیکن ذرا آپ غور فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آئے دن اخبارات میں پڑھنے میں آتا رہتا ہے اور اکثر مشاہدہ میں بھی آتا ہے کہ مکان میں آگ لگ گئی ہے مکین سوتے ہوئے ہیں، باہر سے بچانے اور جگانے والوں کے شور و غل کا طوفان بھی انھیں جگا نہیں پاتا،

دوسری مثال یہ عرض کروں گا، کلکتہ میں دریائے ہگلی کے کنارے چھوٹی بڑی سیکڑوں کشتیاں لنگر انداز ہیں، دن بھر وہ باربرداری اور مسافروں کو ادھر سے اُدھر لانے لے جانے کا کام کرتی ہیں، رات کو ساحل کے ساتھ ساتھ بندھی ان کشتیوں میں ایک زندگی ہوتی ہے مانجھی ان میں کھاتے پکاتے اور سوتے ہیں، یہی ان کا گھر ہوتا ہے، دریا کی موجیں اور پانی کے ہلکورے ان کے کام میں دخل انداز نہیں ہوتے، کشتی ڈگمگاتی رہتی ہے اور وہ لمبی تانے سوتے رہتے ہیں یہ ان کی زندگی کا روزانہ کا معمول ہے، ان کی زندگی طوفانوں سے کھیلتے پانی میں گذر جاتی ہے، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر متوقع دریا میں (Bore Tide) مدوجزر اٹھتا ہے، پورٹ کے حکام خطرے کا سائرن بھی بجاتے ہیں، کشتیوں کے لنگر ٹوٹ جاتے ہیں، پُرشور موجیں گزوں اونچی اٹھ کر ساحل سے ٹکراتی ہیں، لیکن مانجھی سوئے ہی رہ گئے ہیں، ایسی حالت میں یا تو کشتیاں غرقاب ہو جاتی ہیں یا خدا ان ناخداؤں کو بچا لیتا ہے،

ایک اور مثال عرض کروں گا، اس پر بھی آپ غور فرمائیں کہ انسان اپنے قریب ترین

خون کے رشتوں کو جن کے بغیر وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں وہ جی نہیں سکتا، بے یار و مددگار اور بے آسرا ہو جائیگا، اور جب وقت آتا ہے تو اپنے ہی ہاتھوں منوں مٹی کے نیچے دبا آتا ہے اس سے بڑھ کر اس غم زدہ کی زندگی میں ہولناک طوفان اور کیا ہوگا، لیکن جب وہ تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے تو زندگی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی، اور صورتِ حال کی اس ہولناکی کے باوجود نیند اسے آدبوچتی ہے، اور وہ اُن تمام طوفانوں سے بے خبر ہو کر سو جاتا ہے،

یہ تو صوری اور لغوی معنی ہوئے، شعر کے دوسرے علامتی (Symbolic) معنی بھی ہوتے ہیں جہاں شاعر اشارہ، کنایہ، تشبیہ و استعارہ میں بات کرتا ہے، ظاہری معنی سے مقصود کچھ اور ہی ہوتا ہے، چنانچہ یہاں "ناخدا خفتہ است" سے واقعتاً اس کی نیند مراد نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال سے اس کی غفلت اور بے خبری کی طرف اشارہ ہے، اگر آپ بنظر غائر ملاحظہ فرمائیں تو یہ حقیقت فی زمانہ، اس دور میں، اس وقت بھی ہمارے آپ کے سامنے ہے، ہم اور آپ خود اسی صورتِ حال سے گذر رہے ہیں، اخلاقی پستی، مادیت پرستی، جاہ طلبی، حرص و ہوس کا طوفانِ بلاخیز سر سے اونچا ہو چکا ہے، ہر شئی گراں ہے صرف انسانی خون سستا اور انسانیت عنقا ہے، غریب بے بس کشتی کے مسافر خوفزدہ بیم و رجا کی حالت میں صبر و ضبط کا دامن تھامے ہوئے ہیں کہ فریاد و فغاں سوائے خدا کے کوئی سننے والا نہیں، خاموش خون کے آنسو دل سے رواں زندگی کا بارِ گراں لئے تاریکی میں چاروں طرف دیکھ رہے ہیں، راہزنوں کو راہبر سمجھ کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، امید بھری نظروں سے دیکھتے ہیں، آس لگاتے ہیں لیکن ناخدایان ملک و ملت طوفان کی شدت اور طوفان زدوں کی ہیبت اور بے چینی دیکھتے ہوئے بھی کور نظر ہیں، سنتے ہوئے بھی بہرے ہیں، اور جاگتے ہوئے بھی خواب گراں میں مدہوش پڑے ہیں عالمی سطح پر بھی کچھ یہی عالم ہے، نوعیت قدرے مختلف ہے، طاقتور ملک کمزور ملک پر

حادی ان پر اپنے مفاد کے لئے اپنی پالیسی، اپنا نظریہ تھو پنے، لڑنے لڑانے میں مصروف، اندرون وبیرون ملک سازشیں کرنے کرانے میں منہمک سیاسی ہیں، اس سیاسی بازیگری اور طاقت کی رسہ کشی کی بدولت چھوٹے کمزور ملکوں میں آپس ہی میں جنگ وجدل، کشت وخون ہو رہے ہیں، بے گناہوں کے کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں، اور عالمی سیاست کے ناخدا طوفان کی بلاخیزی سے بے خبر خواب غفلت میں پڑے ہیں، ایسے وقت غالب کا یہ شعر پیشین گوئی ہی ثابت ہوتا ہے، ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ است

یہاں سیماب کا ایک شعر بندوں کی جگہ "ناخداؤں" کے تصرف کے ساتھ پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اگرچہ مضمون مختلف ہے ؎

جلال کبریائی چھانے والا ہے دنیا پر
کوئی دن اور ناخداؤں کو خدا سے کھیل لینے دو

میں نے اپنے تاثرات کا اظہار صرف بغرض تبادلۂ خیالات کیا ہے میرے ذہن میں غالب کے شعر کے جو معنی ومطالب ہیں، ممکن ہے محترم مکتوب نگار کا ذہن اسے قبول فرما سکے، جہاں تک فی نفسہٖ غالب کے ذکر کا تعلق ہے بر سبیل تذکرہ میں نے بھی اظہار خیال کر دیا، اعتراض مقصود نہیں، زیر نظر غالب کے شعر کے معنی یہی تھے امید ہے کہ میرے یہ تاثرات محترم ڈاکٹر عبد اللہ صاحب تک پہونچا دیئے جائیں گے، آپ کی "بزم صوفیہ" پڑھی اور کئی بار پڑھی، ہر بار ایک روحانی کیف حاصل ہوا، بزرگانِ دین کی یہ بزم آپنے خوب سجائی، اور اپنی طرزِ تحریر سے خوب بنائی سنواری، آپنے یہ بہت بڑا اور بہت اہم کام کیا ہے کہ

اہم تذکرے تاریخی روشنی میں جامع طور پر حوالہ جات کے ساتھ یکجا کر دیئے ہیں، اسے پڑھنے کے بعد اور دوسری کتاب دیکھنے کی ضرورت اور جستجو نہیں رہتی، ایک سیری سی ہو جاتی ہے اور وہ تشنگی باقی نہیں رہتی جو اور دوسری کتابوں کے دیکھنے کے بعد اکثر رہتی ہے آپنے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے، اللہ تعالےٰ آپ کی محنت قبول فرمائے اور اس کا اجر عطا فرمائے۔

اس بزم میں بہت سے صوفیائے کرام شمولیت سے رہ گئے ہیں، مثلاً خواجہ باقی باللہ دہلوی ان کے دونوں صاحبزادگان خواجہ کلاں وخواجہ خورد، ان کے خلفا میں سے مجدد الف ثانی" اور خواجہ حسام الدین دہلوی، ان کے علاوہ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی حضرت جن کا مزار جامع مسجد دہلی کے سامنے میدان میں ہے، جسے کبھی پریڈ گراونڈ کہا جاتا تھا، یہ بزرگ برہنہ رہتے تھے، اور غالباً اورنگ زیب کے حکم سے ان کا سر قلم کیا گیا تھا، وہیں ایک اور بزرگ ہرے بھرے صاحب کے نام سے خوابیدہ ہیں، ان دونوں بزرگوں کے بارے میں کہیں کوئی مستند تحریر نظر سے نہیں گذری ممکن ہے کبھی کچھ لکھا گیا ہو۔

خدا آپ کو توفیق دے کہ "بزم صوفیہ" کی توسیع کر سکیں اور اس بزم کی اور رونق بڑھا سکیں، آپ کا آغا رشید مرزا۔

سلسلۂ سیرۃ النبی کی جلد ہفتم

سیرت جلد ششم کے ختم ہونے کے بعد سید صاحب نے سیرت جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اس سلسلہ میں چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ مکمل نہیں ہو سکی، یہ انھیں چند متفرق مضامین اور مباحث کا مجموعہ ہے، جن سے اس کے حصہ کا اندازہ ہو سکتا ہے،

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (حصہ دوم)

(عربی ادب)

از

محمد منصور نعمانی ندوی (رفیق دار المصنفین)

پنجاب یونیورسٹی لاہور نے تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے ساتھ عربی ادبیات پر بھی ایک جلد مرتب کرائی ہے، عرصہ سے ایسی تاریخ کی شدید ضرورت تھی، مگر یہ موضوع بڑا طویل تھا، تقریباً بارہ سو سال کے عربی ادب کا جائزہ بڑی توجہ، دقت نظری اور کاوش کا محتاج تھا، ہند و پاک کے اکابر علماء نے مختلف علوم و فنون پر بکثرت عربی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ان طویل خدمات کا احاطہ آسان نہیں، اسی لئے اب تک اس پر خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا، مذکورہ بالا تاریخ کے سلسلہ میں تعجب ہے کہ اتنے اہم اور بڑے کام کے لئے صرف ایک جلد مخصوص کی گئی، جبکہ دیگر زبانوں کے ادبی جائزہ کے لئے کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں، اس میں قدیم ادبی عربی خدمات کے ساتھ دور جدید کے عربی ادب کا جائزہ بھی لیا گیا ہے لیکن عربی کتابوں کے ذکر کے بجائے اکثر ان کے اردو ترجموں پر اکتفا کر لیا گیا، حالانکہ طبعزاد عربی کتابوں کا ذکر ہونا چاہئے تھا، بعض جگہ عربی میں لکھنے والے مصنفین کی عربی تصانیف کے بجائے ان کی اردو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، عربی ادب کا سرسری وار جائزہ لیا جاتا تو اس سے کام وقیع

ہو جاتا اور تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ مہیا ہو جاتا، کسی علمی و تحقیقی کام کا نقائص سے پاک ہونا مشکل ہے، متفرق مواد کی یکجائی، سنین، اسماء، اور اسمائے کتب اور سنین کی غلطیوں کا رہ جانا تعجب انگیز نہیں ہے، جنوری ۱۹۶۹ء کے معارف کے شذرات میں اس جلد کی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، اس کتاب کا جائزہ بعد میں لیا گیا تو بعض اہم غلطیاں نظر آئیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کی تصحیح ہو جائے اور جو چیزیں چھوٹ گئی ہیں ان کا اضافہ بھی کر دیا جائے۔

یہ جلد ۷۱۲ء سے ۱۹۷۲ء تک عربی ادب کے جائزہ پر مشتمل ہے، اس کو سید فیاض محمود، پروفیسر عبد القیوم اور ان کے معاون ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے مرتب کیا ہے، اس جلد میں مقدمہ ملا کر دس ابواب اور ۴۳۲ صفحات ہیں، اس میں ڈاکٹر محمد یوسف، ممتاز احمد پٹھان، پروفیسر محمود، ڈاکٹر احسان الٰہی رانا، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مولانا عبد القدوس ہاشمی، پروفیسر عبد القیوم کے مقالات شامل ہیں، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "ابن حجر اور سخاوی کے جو ہندوستانی علماء حجاز میں فیضیاب ہو کر لوٹے ان میں شیخ جمال الدین محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ اور یعقوب بن الحسن کشمیری متوفی ۱۰۰۳ھ ہیں" (ص ۱۰۰) یہ صحیح نہیں ہے، جن شیخ جمال الدین کا ذکر ہے وہ طاہر پٹنی نہیں بلکہ شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک المعروف بحرق حضرمی ہیں، یہ ہندی الاصل نہ تھے حضر موت ان کا وطن تھا، سخاوی سے کسب فیض کے بعد گجرات آئے، بڑے ادیب، شاعر، محدث اور مصنف تھے، وفات ۹۳۰ھ میں پائی (ظفر الوالہ اول ص ۱۱۹) شیخ طاہر پٹنی اور یعقوب کشمیری علامہ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے جو ابن حجر عسقلانی و سخاوی سے متاخر ہیں، عمر بن اسحاق الهندی کی تاریخ وفات ۷۳۳ھ لکھی گئی ہے، (ص ۱۱) صحیح ۷۷۳ھ ہے، علامہ طاہر پٹنی کا ذکر سراج دہلی ہندی سے پہلے کیا گیا ہے جبکہ ان دونوں کو زمانی تقدم حاصل ہے "محی الدین بن عبد القادر" (ص ۲۱) صحیح نہیں ان کا نام عبد القادر، ابوبکر کنیت اور محی الدین لقب ہے، والد کا نام شیخ بن عبد اللہ

۹۹ھ (تفصیل کے لیے النور السافر دیکھئے) کشاف اصطلاحات الفنون کے مصنف کا نام محمد علاء تھانوی لکھا گیا ہے، (ایضاً) بعض مصنفین نے محمد اعلیٰ درج کیا ہے، اصل کتاب پر واضح طور سے محمد علی بن شیخ علی حنفی تھانوی درج ہے۔

البیرونی کے مصنف کا نام سعید حسن برنی لکھا گیا ہے (ص ۱۱۴) جبکہ صحیح سید حسن برنی ہے، مخلص بن عبد اللہ دہلوی اور قاضی حمید الدین دہلوی (ص ۱۶۳) کو دو الگ الگ شخص سمجھا گیا ہے جبکہ دونوں ایک ہی ہیں، مخلص بن عبد اللہ نام ہے اور حمید الدین لقب، اس غلط فہمی کی وجہ سے مخلص بن عبد اللہ کی شرحِ ہدایہ کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے کہ "اب نادر الوجود ہے" اور قاضی حمید الدین کی شرحِ ہدایہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب کے حوالہ سے درج ہے کہ "اس کا ایک نسخہ برلن میں پایا جاتا ہے" اسی طرح عمر بن اسحٰق متوفی ۷۷۳ھ کے ذکر کے بعد کتبخانہ خدیویہ مصر کے حوالہ سے دوسرے شخص ابوحفص سراج عمر بن اسحٰق الغزنوی الحنفی کا ذکر کیا گیا ہے (ایضاً) ان دونوں ناموں میں التباس ہو گیا ہے، دراصل دونوں ایک ہی شخص ہیں، ان کا نام عمر، والد کا نام اسحاق اور دادا کا نام احمد ہے، ابوحفص کنیت اور سراج الدین لقب ہے، ان کے آباؤ اجداد غزنہ سے ہندوستان آئے، اس نسبت سے غزنوی بھی کہلائے، متصلب حنفی المذہب تھے اس لئے حنفی بھی نام کا جزو بن گیا، لقب اور ہندوستان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے "سراج ہندی" کہلائے، ہدایہ ان کو مستحضر تھی اس لئے قاری ہدایہ کہلائے، اصل میں غلطی صاحبِ کشف الظنون خلیفہ چلپی سے ہوئی ہے، اس کی تردید مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی نے الفوائد البہیہ کے حاشیہ ص ۱۴۸ پر کردی ہے، دوسرے جو شخص قاری ہدایہ کے لقب سے مشہور تھے اور جن کے فتاویٰ "فتاوی سراجیہ" کے نام سے مشہور ہیں ان کے متعلق علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرہ (ج ۱ ص ۲۰۱) پر صراحت سے لکھا ہے کہ ان کا نام عمر بن علی اور لقب سراج الدین تھا، شہرت قاری ہدایہ کے لقب سے پائی، ان کا سنہ وفات ۸۲۹ھ ہے۔

الضوء اللامع مطبوعہ قاہرہ کے سلسلہ میں درج ہے کہ "اس کی تاریخِ اشاعت ندارد" (ص ۱۷۴) یہ کتاب مکتبہ قدسی قاہرہ سے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور اس کی تاریخِ اشاعت سرورق پر بہت واضح طریقہ پر ۱۳۵۵ھ درج ہے، اسی طرح ابن الدمامینی کے حالات میں اس کتاب کے صفحات کے حوالے بھی صحیح نہیں ہیں، مثلاً ص ۱۸۴ کے بجائے ج ۷ ص ۱۸۴ ہونا چاہئے، شیخ علی مہائمی کا سالِ ولادت ۷۷۶ھ لکھا گیا ہے (ص ۱۷۷) جبکہ صحیح ۱۰ محرم ۷۷۶ھ ہے، تفسیر مہائمی کے سلسلہ میں ہے کہ "جمال الدین خاں وزیر بھوپال کے خرچ پر ۲ جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی (ص ۱۷۹) یہ جمال الدین وزیر نہیں مولانا جمال الدین دہلوی مدار المہام وزیر اعظم ریاستِ بھوپال تھے، مولانا اسحٰق دہلویؒ کے فیض یافتہ اور علم دوست اور علم پرور اور نواب صدیق حسن خاں کے خسر تھے، اسی طرح ارأۃ الدقائق فی شرح مرآۃ الحقائق کے سلسلہ میں ہے کہ "یہ جام جہاں نما کا ترجمہ ہے" (ص ۱۸۰) یہ غلط ہے محمد عز الدین المغربی نے فارسی زبان میں جامِ جہاں نما نامی کتاب لکھی، مخدوم علی مہائمی نے مرآۃ الحقائق کے نام سے اس کو عربی کا جامہ پہنایا، یہ ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ اس کے مضامین تشریح و تفصیل کے محتاج ہیں تو اسی مرآۃ الحقائق کی شرح ارأۃ الدقائق کے نام سے لکھی جیسا کہ نزہۃ الخواطر میں بھی درج ہے، ابو الفضائل سعد الدین دہلوی کا ذکر کشف الظنون کے حوالہ سے لکھا گیا ہے "سعد الدین بن عبد اللہ بن عبد الکریم دہلوی" (ص ۱۸۳) لیکن کشف الظنون (ج ۲) پر سعد الدین ابو الفضائل الدہلوی درج ہے، ابو الوفا قرشی نے اپنی کتاب الجواہر المضیئہ فی تراجم الحنفیہ (ج ۲ ص ۱۶۲) پر لکھا ہے کہ ان کا نام محمود بن محمد دہلوی اور لقب سعد الدین ہے اور یہی صحیح ہے، ان کا سنہ وفات بھی کشف الظنون سے ۸۹۱ھ درج ہے، یہ بھی غلط ہے عبد القادر قرشی صاحبِ الجواہر المضیئہ کا انتقال بالاتفاق ۷۷۵ھ میں ہوا یہ دوسرے شخص اس لئے بھی نہیں ہو سکتے کہ قرشی نے المنار کی شرح افاضۃ الانوار ان ہی سے منسوب کی ہے اور

یہاں بھی اسی شرح کے متعلق لکھا گیا ہے، غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام دفتر اول ص۱۸۶
پر سنہ وفات ۱۰۶۲ھ لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے،

قاضی چکن حنفی کی کتاب خزانۃ الروایات کو مدلل و مستند فقہی کتاب لکھا گیا ہے (۱۸۰)
جبکہ حنفی فقہا میں مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے النافع الکبیر ص۱۲ پر اس کتاب کے سلسلہ میں لکھا ہے
کہ یہ غیر معتبر کتابوں سے ترتیب دی گئی ہے اور اس میں رطب و یابس کو جمع کر دیا گیا ہے بعض گڑھی
ہوئی احادیث بھی شامل ہیں، اسی ضعف کے سبب علامہ مخدوم محمد جعفر بوبکانی نے اس کے
تمام غیر معتبر و غیر مستند مواد کو خارج کر کے مفتی بہا مسائل اور قوی روایات کا اضافہ کر کے "المتانۃ
فی مرمۃ الخزانۃ" نام کی کتاب لکھی، یہ کتاب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے ایک مبسوط مقدمہ کے
ساتھ لجنۃ احیاء الادب السندی کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی ہے، اس لئے اس کا ذکر
نہ کرنا شدید غفلت ہی پر محمول کیا جائے گا، مراجع و مآخذ میں رسالہ معارف درج ہے (ص۲۱۱)
اس سے دار المصنفین کے ترجمان معارف کی طرف ذہن جاتا ہے، اس کے بجائے المعارف لاہور
ہونا چاہیے، ابن حجر کی (متوفی ۹۷۳ھ) کے سلسلہ میں ہے کہ جب وہ ملیبار آئے تو اس خانقاہ میں ٹھہرے
تھے" (۲۴۹) اس سلسلہ میں حوالہ رسالہ زمانہ کانپور کا دیا ہے، شیخ ابن حجر کی کا ہندوستان
آنا محل نظر ہے، ان کے حالات و سوانح کے مستند تذکرے اس ذکر سے خالی ہیں، انھوں
نے ۹۴۰ھ سے مکہ مکرمہ میں مجاورت اختیار کر لی تھی، اور درس و افادہ کا سلسلہ زندگی کی آخری
سانس تک اسی مقدس سرزمین میں قائم رکھا، اس بنا پر مکی ان کے نام کا جزو ہو گیا، حالانکہ وہ
مصری المولد تھے، شذرات الذہب (ج ۸ ص ۳۷۰) پر ان کا سنہ وفات ۹۷۳ھ درج ہے
رفیع الدین محدث شیرازی کا سنہ وفات ۹۵۶ھ لکھا گیا ہے (ص ۲۳۱) یہ صحیح نہیں ہے، ان کا
سال وفات ۹۵۴ھ ہے ان کا مزار آگرہ میں ہے (بوستان اخبار ص ۱۰۸، اخبار الاخیار ص ۲۳۶)

اعلام باعلام بیت اللہ الحرام کے مصنف قطب الدین حنفی نہروالی مفتی مکہ کے تذکرہ میں لاہوری
کا اضافہ کیا گیا ہے (ص۲۴۵) اس سلسلہ میں حوالہ بھی نہیں ہے، نہروالہ تو گجرات میں پٹن کے
علاقہ کو کہا جاتا ہے، اغلب یہی ہے کہ ان کی ولادت احمد آباد میں ہوئی ہو، (اسی کتاب کے
ص۲۴۲ پر نہروالہ کو صوبہ گجرات پٹن لکھا گیا ہے) ان کی مشہور تاریخ وفات تو ۹۹۰ھ ہے
لیکن ظہور احمد اظہر کے حوالے سے ۹۹۶ھ بھی لکھا گیا ہے، اس موقع پر یاد ایام مصنفہ مولانا حکیم
عبد الحی کا ذکر بھی ہونا چاہئے تھا، جس میں ۹۹۰ھ درج ہے، اسی طرح قطب الدین نہروالی کے بھتیجے
بہاء الدین عبد الکریم قطبی کے سلسلہ میں ہے کہ "انھوں نے اعلام بیت اللہ الحرام کی تلخیص کی ہے
اور اس کا ایک نسخہ بانکی پور میں ہے" (ص۲۵۹) جبکہ اس کے کئی نسخوں کا پتہ چل چکا ہے ایک قلمی
نسخہ مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ اور ایک دار الکتب المصریہ میں بھی ہے، ان ہی دونوں
نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد یہ تلخیص "تاریخ البلد الحرام" کے نام سے احمد محمد جمال اور عبد العزیز
الرفاعی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں مکتبۃ الثقافۃ باب السلام مصر سے عربی ٹائپ میں
طبع ہو چکی ہے، صفحات کی تعداد ۴۰ ہے، حاجی محمد بن عمر آصفی مصنف ظفر الوالہ کا ذکر ص۲۹۳ پر ہے، ص۲۹۴
پر عبد القادر حضرمی کے ذکر میں پھر مصنف ظفر الوالہ کا ذکر آ گیا ہے، اور ص۲۹۵ کے نصف تک
ان ہی کا ذکر ہے، دونوں کا تذکرہ گڈمڈ ہو گیا ہے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "آصفی نے اپنی کتاب
(ظفر الوالہ) میں ان تمام کتب تاریخ سے استفادہ کیا ہے، جو اس وقت دستیاب تھیں مثلاً
ابو الفضل، الجورجانی، ضیاء برنی" (ص۲۹۴) یہ نام کتابوں کے نہیں ہیں بلکہ مصنفین کے ہیں
ان مصنفین کی کتابوں کے نام بہ ترتیب اکبر نامہ، طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی ہونا
چاہئے تھا، الجورجانی نہیں الجوزجانی صحیح ہے، اسی طرح ملا عبد السلام دیوی کو اعظمی لکھا
(ص۲۹۹) اس سلسلہ میں حوالہ نزہۃ الخواطر کا دیا ہے حالانکہ اس کتاب میں دیوی کو مضافات لکھنؤ

میں بیان کیا گیا ہے، دراصل دیوتی لکھنؤ کے قریب ضلع بارہ بنکی کا مشہور قصبہ ہے لکھتے ہیں "شیخ عبدالحق
محدث دہلوی کے صاحبزادے نورالحق دہلوی ۹۲ سال کی عمر میں فوت ہوئے (ص۳۶۶) جبکہ سنہ
ولادت ۹۸۳ھ اور سنہ وفات ۱۰۷۳ھ ہے، اس حساب سے ۹۰ سال کی عمر ہوئی، الفوائد البہیۃ فی
تراجم الحنفیہ اور التعلیقات السنیہ علی الفوائد البہیہ دونوں کو مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کی
تصنیف قرار دیا ہے (ص۱۴۰) پھر آگے چل کر شکوہ کیا ہے کہ اس کتاب میں متقدمین حنفی فقہاء کے
ذکر پر زور دیا گیا ہے اور برصغیر کے حنفی علماء کو نظرانداز کر دیا ہے (ص۲۰۲) یہاں مقالہ نگار سے
صریحاً غلطی ہوئی ہے مولانا نے مقدمہ میں صراحت کر دی ہے کہ یہ تالیف ہے علمائے احناف کا کوئی
خاطر خواہ تذکرہ نہ تھا وہ تذکرہ مرتب کرنے والے ہی تھے کہ اسی دوران ان کو کفوی متوفی سنہ ۹۹۰ھ
کی مشہور کتاب "کتائب اعلام الاخیار" مل گئی جو "طبقات کفوی" کے نام سے بھی معروف ہے
مولانا نے علماء و مصنفین کے احوال کو اختصار کے ساتھ اس سے نقل فرمایا اور جو مواد انھوں
نے اس سلسلہ میں جمع کیا تھا، اس کو بھی اس میں شامل کر دیا، کتاب کی ترتیب میں اس کا
اہتمام رکھا کہ طبقات کفوی کے مطالب نقل کرنے کے بعد دوسرے ذرائع سے اخذ کردہ حالات
وسوانح کو "قال الجامع" کے تحت آگے نقل کر دیں، اس سلسلہ میں کفوی سے جو غلطیاں ہوئی
ہیں ان کی بھی تصحیح کرتے گئے ہیں اور بر سبیل تذکرہ جن اشخاص و اعلام کا ذکر و حوالہ آیا ان کے
مختصر احوال و خدمات اصل کتاب کے حاشیے پر درج کرتے گئے، ان حواشی کا نام التعلیقات السنیہ رکھا
اس طرح اس تالیف میں یہ شکوہ بیجا ہے کہ برصغیر کے حنفی علماء کو نظرانداز کیا گیا ہے، اسی طرح
مولانا کی تصانیف میں دو اہم کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ
اور الرفع والتکمیل یہ دونوں کتابیں ۱۹۶۴ء و ۱۳۸۳ھ میں استاذ عبدالفتاح ابوغدہ
کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ مکتب المطبوعات الاسلامیہ حلب سے شائع ہو چکی ہیں نواب صدیق حسن

کی تاریخ وفات ۱۸۸۹ء، ۱۳۰۷ھ لکھی ہے (ص۲۰۳) حالانکہ ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خان
نے سیرت والاجاہی (۳-۲۰۰) میں ۲۹ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰ فروری سنہ ۱۸۹۰ء لکھی ہے
ایک جگہ ذکر ہے کہ "مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی ندوہ کے معتمد بھی رہے" (ص۲۰۴) یہ صحیح نہیں ہے
پہلے مولانا مددگار ناظم ہوئے، اس کے بعد ناظم مقرر ہوئے، (تفصیل کے لئے حیات عبدالحیؒ
دیکھئے) ایک جگہ مولانا اعزاز علی کی تصانیف کا ذکر ہے (ص۱۱۴) اس میں انھوں نے شاہ ولی اللہ
دہلویؒ کی فارسی تصنیف اصول تفسیر میں الفوز الکبیر کے حروف مقطعات والے حصہ کا جو عربی
ترجمہ کیا ہے اس کا ذکر رہ گیا، معجم المصنفین کے مصنف کا نام محمد حسن خان درج ہو گیا ہے (ص ۱۶۴)
جبکہ مولانا محمود حسن خاں ٹونکیؒ (متوفی سنہ ۱۳۶۶ھ) ہونا چاہئے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ "مولانا حبیب الرحمن
اعظمی نے مسند الحمیدی ایڈٹ کی" (ص۱۴۳) صحیح نام المسند الحمیدی ہے جو دو جلدوں میں سنہ ۱۹۶۳ء
میں شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق،
امام عبدالرزاق کی المصنف کی گیارہ جلدیں، طاہر پٹنی کی مجمع بحار الانوار ۵ جلدیں، سعید بن منصور
کی کتاب السنن بھی ایڈٹ کی ہیں اور یہ شائع بھی ہو چکی ہیں، ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ایک جگہ مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ "مولانا شبلی کی تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں" (ص۲۱۴)
یہ صحیح نہیں، مولانا شبلیؒ عربی کے بھی صاحب نظر عالم اور ادیب تھے، انھوں نے سب سے پہلے "اسکات
المعتدی علی انصات المقتدی" کے نام سے ۴۴ صفحات پر عربی زبان میں رسالہ لکھا جو مطبع نظامی
کانپور سے سنہ ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوا، علی گڑھ کالج میں طلبہ کے اندر ذات رسالت مآب سے عقیدت
پیدا کرنے کے لئے "تاریخ بدء الاسلام" نامی عربی میں ایک کتاب لکھی، یہ کالج میں عرصے تک
داخل نصاب رہی، ۴۴ صفحات میں مطبع مفید عام اکبرآباد سے غالباً سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی
اس کا ترجمہ پہلے مولانا فراہی نے فارسی میں کیا، اور اس فارسی ترجمہ سے اردو ترجمہ نو[illegible]

سلطان شاہ بانو نے کیا جو مطبع سلطانی بھوپال سے سنہ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا، مولانا نے جزیہ
ایک معرکۃ الآرا مضمون اردو زبان میں تحریر کیا تھا بعد میں اپنے تحقیقی کارنامہ کو عربوں سے
روشناس کرانے کے لئے خود اس کا عربی ترجمہ کیا جو الجزیہ کے نام سے مفید عام آگرہ سے سنہ ۱۳۱۲ھ
میں ۸۰ صفحات پر شائع ہو چکا ہے، عیسائی مؤرخ و ادیب جرجی زیدان کی تاریخ التمدن
الاسلامی کا بہت مبسوط و مدلل جواب الانتقاد علی التمدن الاسلامی کے نام سے لکھا، اس
رسالہ سے مولانا کی شہرت عالم اسلام میں خوب ہوئی، یہ سنہ ۱۹۱۲ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے ۸۲
صفحات پر شائع ہوا ہے، اس کے علاوہ حیاتِ شبلی میں مولانا کی کچھ عربی تحریریں اور کچھ
عربی خطوط بھی نقل کئے گئے ہیں، سفرنامہ مصر و شام کے آخر میں جدید عربی الفاظ کی ایک فرہنگ
بھی مولانا نے اپنے قلم سے شامل کی ہے، مقالہ نگار نے لکھا ہے "سیرۃ النبی کا عربی ترجمہ شائع ہو گیا
ہے" مصر میں اس کا عربی ترجمہ تو ہوا ہے لیکن یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، یہی مقالہ نگار
لکھتے ہیں "مولانا سید سلیمان ندوی پٹنہ کالج میں عربی اور فارسی کے استاد رہے" (ص ۱۹۴) یہ صحیح
نہیں، دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تھا (تفصیل
کے لئے حیاتِ سلیمان ص ۷۲ دیکھئے) وہ آگے چل کر کہتے ہیں "انھوں نے عربی زبان میں کوئی تصنیف
یادگار نہیں چھوڑی" یہ بھی صحیح نہیں ہے عربی زبان میں بچوں کے لئے دروس الادب کے
نام سے دو حصے لکھے، علامہ سیوطی کی "عین الاصابۃ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃ علی الصحابۃ" کی
تصحیح اور تعلیق کی اور اس کو سیرت عائشہ کے آخر میں شامل کیا، اسی طرح انھوں نے اپنی تحقیقات
"کتاب خیام" میں عمر خیام کے پانچ عربی رسالے تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع
کئے، (تفصیل کے لئے خیام کا مطالعہ کیجئے) اسی طرح مولانا حمید الدین
فراہی (متوفی سنہ ۱۹۳۰ء) کی "امعان فی اقسام القرآن" دار المصنفین کی طرف سے مصر سے طبع

کرائی تو اس کے آخر میں آٹھ صفحات کا ایک تذکرہ "ترجمۃ صاحب ہٰذہ الرسالۃ" کے عنوان سے
لکھا، جس میں مولانا فراہی کی علمی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ ہے، یہ قاہرہ سے سنہ ۱۳۴۹ھ میں شائع
ہو چکا ہے، اس کے علاوہ کتاب المعتبر و صاحبہ ایک طویل عربی مضمون انھوں نے لکھا
جو دائرۃ المعارف حیدر آباد کی دعوت پر وہاں پڑھا گیا، عربی مقالات کے مجموعے مطبوعہ حیدر
آباد سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ مضمون شامل ہے، اس مضمون کا اردو ترجمہ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی
نے کیا تھا جو معارف میں دو قسطوں میں شائع ہو چکا ہے، لغات جدیدہ بھی ان کی ایک اہم یادگار
ہے جو مطبوعہ ہے، مکاتیب سلیمان (مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی) میں کچھ عربی خطوط بھی
سید صاحب کے موجود ہیں،

اردو کے ذریعہ عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرنے والوں میں مولانا عبد الرشید
نعمانی کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس میں ان کی ایک کتاب کا نام "شرح ماجہ" لکھا گیا ہے (ص ۱۴۳)
یہ اردو کی نہیں عربی زبان کی کتاب ہے، "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" یہ بڑے
سائز پر اصح المطابع آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ مولانا کی اور کتابوں
کا ذکر نہیں کیا، مثلاً دراسات اللبیب محمد معین سندھی کو ایڈٹ کیا اور اس پر ایک مقدمہ
بھی تحریر فرمایا، یہ کتاب لجنۃ احیاء الادب السندی کراچی سے سنہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے
اور علامہ عبد اللطیف محمد ہاشم الحارثی التتوی السندی کی ذب ذبابات الدراسات عن
المذاہب الاربعۃ المتناسبات بھی مولانا کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ سنہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی،
ایک جگہ لکھا ہے "مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم کا کارنامہ نفحۃ العنبر ہے" (ص ۱۹۴) اس سے
بھی زیادہ اہم مولانا کا کارنامہ امام زیلعی کی مشہور کتاب "نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ"
کی تحقیق و تعلیق ہے، یہ سنہ ۱۹۳۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع

ہو چکی ہے مولانا کا دوسرا اہم کارنامہ ترمذی کی عربی شرح ہے، جس کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح انھوں نے مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کی مشکلات القرآن پر ایک طویل عربی مقدمہ "یتیمۃ البیان لمشکلات القرآن" کے عنوان سے لکھا جو ۱۳۵۵ھ میں دہلی سے شائع ہو چکا ہے، ان تینوں کارناموں کا ذکر بھی نہیں کیا گیا،

عربی خدمات میں حیرت ہے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ذکر نہیں کیا گیا، جبکہ انھوں نے عربی زبان و ادب اور علوم القرآن کی غیر معمولی خدمت کی ہے، ان کی تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان، امعان فی اقسام القرآن، دلائل النظام، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل، مفردات القرآن، دیوان المعلم اور جمہرۃ البلاغۃ وغیرہ کا ذکر رہ گیا ہے، اسی طرح مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تفسیر المعوذتین کا ذکر بھی رہ گیا ہے، جبکہ یہ کتاب مجلس معارف القرآن دیوبند سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکی ہے، ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر مولانا سعید انصاری کی تحقیق و تعلیق سے "ملتقط جامع التاویل لمحکم التنزیل" کے نام سے ۱۳۴۰ھ میں قاہرہ سے طبع ہو کر دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہے، اس کا ذکر بھی رہ گیا ہے، مولانا فضل اللہ الجیلانیؒ کی شرح "فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد" کا ذکر نہیں کیا گیا جبکہ یہ مکتبہ سلفیہ قاہرہ سے ۱۳۷۸ھ میں شائع ہو چکی ہے، مولانا عبد الخالق خان افغانی نے مصنف ابن ابی شیبہ فی الاحادیث والآثار کو تین جلدوں میں ایڈٹ کیا اور یہ ۱۳۸۶ھ میں حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے، اسی طرح مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری کی شرح ترمذی "تحفۃ الاحوذی" اور مولانا عبید اللہ رحمانی کی شرح مشکوٰۃ "مرعاۃ المفاتیح" کا ذکر نہ کرنا بڑی افسوسناک بات ہے، مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی حجۃ الوداع و عمرات النبی اور الابواب والتراجم للبخاری کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے، یہ دونوں کتابیں بھی مطبوعہ ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ کی ایڈٹ کی ہوئی کتاب

النبات (ص ۴۱۳) نہیں بلکہ کتاب النبات ہے، اسی طرح ان کی کتابوں میں "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ" کا ذکر رہ جانا تعجب خیز ہے، یہ ۱۹۴۱ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "شرح معانی الآثار آپ کی یادگار ہے" (ص ۴۱۰) یہ بھی صحیح نہیں ہے، یہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی شرح ہے جو امانی الاحبار شرح معانی الآثار للطحاوی کے نام سے ہے، مولانا ابو عبد اللہ محمد سورتی کا ذکر کیا گیا ہے (ص ۴۰۹) اور مولانا بدر الدین علوی کا ذکر رہ گیا ہے انھوں نے مختار المختار کو ایڈٹ کر کے بڑے اہتمام سے قاہرہ سے طبع کرایا ہے، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے (ص ۴۱۵) اور ان کی کتابوں میں صرف موقف العالم الاسلامی، القادیانیہ اور روائع اقبال کا ذکر ہے جبکہ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ان کی شہرۂ آفاق کتاب ہے، رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام، المسلمون فی الہند، الارکان الاربعۃ اور السیرۃ النبویۃ وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اسی طرح نواب صدیق حسن خان کی نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام، نواب علی حسن خاں کی فتح العلام شرح بلوغ المرام، مولانا اویس نگرامی کی تفسیر ابن قیم، مولانا امتیاز علی عرشی کی ایڈٹ کردہ تفسیر سفیان ثوری کا بھی ذکر نہیں کیا، ڈاکٹر عبد العلیم کی عربی خدمات سے بھی اغماض برتا گیا ہے، انھوں نے پی، ایچ، ڈی کا مقالہ "اعجاز القرآن" پر لکھا، عربی زبان میں ہے اور شائع ہو چکا ہے، اسی طرح انھوں نے ابو الحسن بن عیسیٰ الرمانی (متوفی ۲۹۶ھ) کی "النکت فی اعجاز القرآن" کو بھی ایڈٹ کیا جو ۱۹۳۴ء میں دہلی سے اور محمد ابن محمد الخطابی (متوفی ۳۸۸ھ) کی "البیان فی اعجاز القرآن" کو ایڈٹ کیا، یہ علی گڑھ سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ انھوں نے نزہۃ الطرب اور معرفۃ المذاہب کو بھی ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، ڈاکٹر صدر الدین قضا نے موفق ابی محمد عبد اللہ بن احمد بن قدامہ الدمشقی (متوفی ۶۲۰ھ) کی کتاب الوصیۃ کو ایڈٹ کر کے

سنہ ۱۹۵۹ء میں پٹنہ سے شائع کیا ہے، اس کا ذکر بھی رہ گیا ہے، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو نے المختار
من شعراء ابن المدینۃ سنہ ۱۹۶۲ء میں ایڈٹ کرکے علی گڑھ سے شائع کی، اس کتاب اور اس کے علاوہ
ان کی دیگر عربی خدمات کا ذکر بھی کرنا چاہیئے تھا، مولانا غضنفر حسین ساکرنالکی کی کتاب "الانابۃ الی
شعر الصحابۃ" کا ذکر بھی نہیں کیا گیا، یہ کتاب بھی مطبع عزیزیہ حیدر آباد سے سنہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہو چکی ہے
اسی طرح ڈاکٹر محمد احمد الصدیقی نے الہ آباد یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۵۳ء میں ابن الحریری و مقاماتہ پر پی، ایچ،
ڈی کی ڈگری حاصل کی، یہ مقالہ مطبوعہ ہے، اس کے علاوہ انھوں نے "تذکرات المحدثین"، "الصوفیین"
اور حیاۃ عبد اللہ بن مسعودؓ پر عربی زبان میں مفید کتابچے لکھے یہ سب مطبوعہ ہیں، ان کا ذکر رہ
گیا ہے، مولانا محمد یوسف کوکن عمری نے "امیر خسرو و حیاتہ وعملہ و تالیفاتہ" پر ایک طویل عربی مقالہ لکھا
یہ مطبوعہ ہے، مولانا مسعود عالم ندوی و مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی کی عربی خدمات اور مولانا عبد الرحمٰن کاشغری
کے دیوان شعر الزہرات، مولانا ناظم ندوی کے خطبات مدراس کے عربی ترجمہ الرسالۃ المحمدیہ اور ندوہ
کے موجودہ دوسرے اہل قلم حضرات کی خدمات سے صرف نظر کیا گیا ہے جس سے دور حاضر کا جائزہ
بہت تشنہ و نامکمل ہے، ایک جگہ درج ہے "ندوہ کے ناظمین میں علامہ شبلی کے علاوہ مولانا عبد الحی
حسنی، نواب صدیق حسن خان کے صاحبزادے علی حسن خان اور ڈاکٹر عبد العلی شامل ہیں" یہ صحیح نہیں،
علامہ شبلی ندوہ کے ناظم نہیں معتمد تعلیم تھے، پہلے ناظم مولانا محمد علی مونگیری تھے، ان کے بعد نواب
علی حسن خان، پھر ڈاکٹر عبد العلی مرحوم ہوئے، ان کا انتقال سنہ ۱۹۶۱ء میں ہوا اس کے بعد سے ندوہ
کے ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ہیں، اس کی صراحت بھی نہیں کی گئی، اسی طرح اردو کے ذریعہ
عربی و اسلامی علوم کی خدمت کرنے والوں میں صرف ۱۵ اشخاص کی فہرست دی ہے (ص ۲۲۳)
جبکہ ان خادموں کی تعداد خاطر خواہ ہے، اس ذیل میں مولانا عبد الحفیظ بلیاوی اور مولانا وحید
الزمان کی اردو عربی لغات بھی قابل ذکر تھیں، عربی زبان و ادب کی تحقیق و ترویج کے سلسلہ میں چند

کم معروف اشاعتی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے، (ص ۴۲۰) نولکشور لکھنؤ کی خدمات سے صرف نظر کرنا
حیرت کی بات ہے، اسی طرح مجلس علمی ڈابھیل و کراچی، بمبئی کے شرف الدین الکتبی و اولادہ،
مجلۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد، مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں، المکتبۃ السلفیہ بنارس،
تحقیقات و نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ، ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد جیسے عربی کی خدمت
کرنے والے اداروں سے اغماض برتا گیا ہے، بروکلمن نے عبد القادر عیدروسی کی ۲۵ تصانیف
کے نام گنائے ہیں، جو تمام کی تمام بوہار کے کتب خانہ میں موجود ہیں (ص ۲۹۵) ان کی ۳ تصانیف
کا پتہ چل چکا ہے، معارف جولائی و دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء کے شماروں میں ان کی نشان دہی کی گئی ہے، النور السافر
کے علاوہ دوسری کتاب فضائل الاحیاء ہے، جو احیاء العلوم غزالی کے حاشیہ پر مصر سے شائع
ہو چکی ہے، (تفصیل کے لئے مذکورہ بالا معارف دیکھئے) جمال الدین محمد بن محمد ابی بکر الشلی نے
النور السافر کا جو ذیل لکھا ہے اس کا نام تکملۃ النور السافر ہے (ص ۲۰۸) اس کا صحیح نام السنا
الباہر بتکمیل النور السافر ہے، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کی مرتب کردہ کتاب کا نام انوار العلوم (ص ۲۲۵)
نہیں بلکہ انوار العیون ہے، شیخ عبد النبی گنگوہیؒ کی کتاب وظائف النبی کے صرف ایک مخطوطہ علی گڑھ
کا ذکر کیا ہے (ص ۲۴۸) جبکہ اس کا ایک مخطوطہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے جو دسویں
صدی ہجری کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، ایک جگہ ذکر ہے "مقبول مفتی غلام سرور مقبول عام و خاص (ص ۲۹۶)
اس کو بقول مفتی غلام سرور ہونا چاہیئے، ایک اور جگہ ہے "کتاب المصفا من الشفا جو عباس قاضی
کی الشفا کا خلاصہ ہے" (ص ۱۹۵) یہ صحیح نہیں ہے یہ قاضی عیاض کی الشفا ہے،

عربی ادب کی اس تاریخ میں الفاظ و بیان، تعبیر و اسلوب میں بھی کچھ خامیاں نظر آتی ہیں،
ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں، "عربی کی شخصیت اور زیادہ ابھری اور اسے پہلوانی
کرتب دکھا کر اپنی قوت و ثروت کی نمائش کا موقع ملا" (ص ۱۴) "عباسی خلیفہ کے زمانۂ خلافت میں

وہ حج پر گئے" (ص ۱۲۴) "یک نے اسی مذہب کی پرورش کی" (ص ۱۱۹) "جوان کی اشہر التالیفات ہے" (ص ۱۳۲) "واعظ ناصر الدین الترمذی دہلی آیا" (ص ۱۳۶) "النفائی" (ص ۱۳۰) شمس الدین محمد بن یحییٰ اللاذی (ص ۱۳۰) "انھوں نے علم کی شمع روشن کی جس نے تشحیذ دماغ کے ساتھ دل کی تربیت کا سامان مہیا کیا" (ص ۱۴۱) "علم اور محبت کی جیوت جلائی" (ص ۱۴۲) "ایبک جب خطۃ الملوکیہ کے سایہ میں پہلی بار بیٹھا" (ص ۱۴۰) "امام ہو گذرے ہیں" (ص ۱۴۰)۔

تاریخ ادبیات کی انیسویں جلد عربی ادبیات کے اشاریہ پر مشتمل ہے، اس کو رحمان ملک اور نادرہ زیدی نے ایڈٹ کیا ہے، نظرثانی پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور سہیل احمد خان نے کی ہے، یہ اشاریہ بہت مفصل اور جامع ہے، اشخاص، امکنہ اور کتب کے علاوہ ادبی و علمی اصطلاحات، اقوام و قبائل، علوم و فنون، اصناف ادب، مدارس، ادارے اور واقعات سب کے الگ الگ اشاریے اس میں شامل ہیں، اس میں ۱۴۴ صفحات ہیں، تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہتر گائڈ کا کام دیگی، ذیل میں ہم صرف اشخاص اور کتب کے حصہ کی فروگذاشتوں پر توجہ دلا رہے ہیں،

ابن ابی اصیبہ (ص ۱) ابن ابی اصیبعہ ہے، ابن جو ہیتمی (ص ۲) ابن حجر ہیتمی کی ہونا چاہیئے، قاضی اظہر (ص ۱) صحیح قاضی اطہر مبارکپوری ہے، جمال الدین محمد الحمیدی الشافعی (ص ۵) صحیح الجبیری ہے، جلال الدین دوانی (ص ۱۰) میں دوانی ہے، شہاب الدین دولت آبادی ابن الدمامینی (ص ۱۰) دراصل یہ دو نام ہیں، مگر اس انداز سے لکھا گیا ہے جیسے کہ ایک ہی نام ہو، قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا انتقال ۸۴۹ھ میں جونپور میں ہوا، اور بدر الدین ابن الدمامینی کی وفات ۸۲۷ھ میں گلبرگہ میں ہوئی، عیاص قاضی (ص ۱۸) یہ دراصل قاضی عیاض صاحب الشفا ہونا چاہیئے، مولانا عبدالحئی چشتی (ص ۱۹) مولانا حکیم عبدالحئی حسنی صحیح ہے، عبدالسلام

اعظمی (ص ۲۰) صحیح عبدالسلام دیوی ہے، عبدالقادر عیدروس اور عبدالقادر حضرمی دونوں ایک ہی ہیں مگر ان کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے (ایضاً) قاضی عنایت اللہ مونگیپوری (ص ۲۲) صحیح مونگیری ہے، محمد حسن خان ٹونکی (ص ۲۰) صحیح محمود حسن خان ہے، شیخ علی بن احمد المہائمی الشافعی النائطی المکی (ص ۳۲) الدکنی ہونا چاہیئے، مولانا وحید الزمان خان رشید (ص ۳۳) صحیح شہید ہے، آداب احمد ملا جیون (ص ۴۴) صحیح آداب احمدی ہے، اخبار الاخبار (ص ۴۴) صحیح اخبار الاخیار ہے، اصول الشابی (ص ۲۵) یہ اصول فقہ کی مشہور کتاب اصول الشاشی ہے، اضافۃ المنار شرح المنار (ایضاً) صحیح نام افاضۃ الانوار فی شرح منار الانوار ہے، زرکلی الاعدم (ص ۲۶) صحیح الاعلام ہے، البیان والتبیین الیعقوبی (ص ۲) یہ جاحظ کی مشہور زمانہ کتاب ہے، الضوء اللامع از شمس الدین سخاوی دوسری جگہ حافظ شمس الدین (ص ۰) دونوں ایک ہی ہیں مگر ان کا ذکر دو جگہ دو شخص سمجھ کر کیا گیا ہے، الفتاوی العالمگیریہ اور الفتاوی الہندیہ (ص ۱) دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں، مگر دو کتابیں خیال کر کے الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، الفتح الربانی ص ۱۱ (۱) صفحات کا ہندسہ صحیح نہیں اس کا ذکر ص ۱ پر ہے، القاموس مجدالدین فیروز آبادی (ص ۲) صحیح مجد الدین ہے، اللآلی فی شرح امالی الحالی (ص ۲) صحیح نام امالی القالی ہے، امانی الاخبار شرح معانی الآثار (ص ۳) صحیح نام امانی الاحبار ہے، انوار العلوم شیخ عبدالقدوس گنگوہی (ص ۵) صحیح نام انوار العیون ہے، بغیۃ الوعاۃ (ص ۶) کے مصنف کا نام نہیں لکھا، اس کے مصنف علامہ سیوطی ہیں، تاریخ الامت از احمد سعید دہلوی (ایضاً) صحیح نہیں ہے، اس کے مصنف و مترجم مولانا اسلم جیراجپوری ہیں، تاریخ فتنۃ الہند از مولانا فضل حق خیرآبادی (ص ۰) صحیح نام الثورۃ الہندیہ ہے، تحقیق ملل الہند از البیرونی (ص ۰) صحیح نام تحقیق ما للہند ہے، حاشیہ ہدایہ، حاشیہ خیالی و حاشیہ شرح صحائف و شرح منار مفتاح از عبدالسلام اعظمی (ص ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۵) یہ عبدالسلام دیوی ہیں، رجال السند والہند از پروفیسر محمد اسحاق دوسری جگہ قاضی اطہر مبارکپوری

(ص ۸۶) آخر الذکر صحیح ہے ، زاد الطالبین از محدث کبیر (ص ۸۸) صحیح نام یہ ہے علی بن حسام الدین متقی متوفی ۹۷۵ھ ، زجاج المصابیح (ص ۸۹) صحیح زجاجۃ المصابیح ہے ، شرح جامی از عبد الرحمٰن جامی (ص ۹۳) صحیح عبد الرحمٰن جامی ہے ، طبقات تاج الدین (ص ۹۵) پورا نام طبقات الشافعیہ ہے ، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر مرتب سراج السندی (ص ۹۸) یہ بڑی افسوس ناک غلطی ہے ، سراج ہندی کا انتقال ۷۷۳ھ میں ہوا ہے ، اور یہ فہرست زمانۂ حال میں استاد محمد علی البیلاوی و شیخ احمد الیسی کی محنت وکاوش سے مرتب ہوئی ہے ، اور ۱۳۰۵ھ سے ۱۳۱۰ھ کے عرصہ میں اس کی آٹھ جلدیں شائع ہوئی ہیں ، معجم الابار یاقوت (ص ۱۰۴) صحیح نام معجم الادبا ہے ، معجم المومنین از عمر رضا کمال صحیح نام معجم المؤلفین ہے ، منتخب التواریخ از قطب الدین محمد بن علاؤ الدین احمد حنفی یزدانی اردو ترجمہ از بدایونی (ص ۱۰۶) یہ بھی صحیح نہیں ہے ، یہ فارسی زبان میں ملا عبد القادر ابن ملوک شاہ بدایونی کی مشہور تاریخ ہے ، اس کا اردو ترجمہ محمود احمد فاروقی نے کیا ہے ، اور یہ پاکستان سے شائع ہوا ہے ، ہدایۃ العارفین از اسمٰعیل پاشا البغدادی (ص ۱۰۸) اس کا صحیح نام ہدیۃ العارفین ہے ،

ایسی بہت سی اور فروگذاشتیں ہیں جو پاکستان کے علمی حلقے کی بدنامی کا باعث ہیں ، ضرورت ہے کہ اس کو پھر سے پوری احتیاط اور محنت کے ساتھ ترتیب دیا جائے ،

اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں

اسلامی علوم وفنون پر ہندوستانی علماء نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر مولانا سید عبد الحئی صاحب نزہۃ الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک بڑی ہی محققانہ کتاب لکھی تھی ، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے ، اور اپنے موضوع پر بہت جامع ہے ، قیمت ۱-۲۰/

"ملیحر"

مطبوعات جدیدہ

مآثر دکن مولفہ سید علی اصغر بلگرامی ، متوسط تقطیع ، کاغذ ، کتابت وطباعت اعلیٰ ، صفحات ۱۳۰، قیمت مجلد ۳۳ روپئے ، پتہ مکتبہ رحمانیہ ، اردو بازار لاہور ۔

دکن میں مسلمانوں نے چھ سو سال تک حکمرانی کی ، اس طویل عرصہ میں وہاں اپنی تہذیب وثقافت کا گہرا اثر چھوڑا ہے ، قلی قطب شاہ اور اس کے جانشینوں نے اس سرزمین پر بہت سی نادر عمارتیں تعمیر کرائیں جو ان کے اعلیٰ تعمیری ذوق کا ثبوت ہیں ، جناب سید علی اصغر بلگرامی صاحب ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۲ء تک ناظم سررشتۂ آثار قدیمہ رہے ، اس عرصہ میں انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب مرتب کی ، اس میں حیدرآباد ، گولکنڈہ اور اس کے اطراف کے مقبروں اور عمارتوں کا ذکر ہے ، ان کا ارادہ تھا کہ اسی انداز پر دہ اور عمارتوں اور یادگاروں کے بارے میں قیمتی دستاویز تیار کریں ، مگر سرکاری مصروفیات رہیں اور عمر نے بھی وفا نہیں کی ، اس لیے یہ کام اسی پر ختم ہوگیا ، اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ، پہلے باب میں حیدرآباد اور اس کے مضافات ، دوسرے میں گولکنڈہ اور اس کے نواح کی عمارتوں کا ذکر ہے ، چار مینار ، مقبرۂ احمد شاہ ، مدرسہ محمود گاواں ، عاشور خانۂ بادشاہی ، ہفت گنبد ، دار الشفاء ، کمتہ پل ، علی بریدہ کا گنبد ، مکہ مسجد ، جامع مسجد ، شاہان گولکنڈہ کے مقبروں وغیرہ سے متعلق مفید معلومات فراہم کیے گئے ہیں ، جس سے مولف کی تلاش وتحقیق کا اندازہ ہوتا ہے ، عمارتوں کی تاریخی اور

جغرافیائی حیثیت اور ان کے طرزِ تعمیر کی تفصیل بیان کرنے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے دستاویز، نقشے، فوٹو، اور روداد وں سے مدد لی گئی ہے اور خود مولف نے ان کا ذاتی مشاہدہ بھی کیا ہے، عمارتوں کی تعمیر کا سنہ شاہِ وقت کی حکومت کی مناسبت سے قیاساً درج کیا گیا ہے، اس کے شروع میں تعارف ڈاکٹر معین الدین عقیل کے قلم سے ہے، جس میں مولف کے حالات اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر ہے، اس میں قیمتی اور نادر تصویریں بھی ہیں، آخر میں انڈکس بھی شامل ہے، ۱۳۳۲ء ہی میں حیدر آباد سے یہ کتاب شائع ہوئی تھی، لیکن اب کمیاب تھی، حافظ محمد حید ر میموریل اکیڈمی کراچی کی طرف سے یہ بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، جس سے حیدر آباد کی عظمتِ رفتہ پھر سامنے آگئی ہے، امید ہے کہ یہ شوق و دلچسپی سے پڑھی جائے گی،

حجاب، ایک تحریک چار کہانیاں نمبر، مرتبہ مائل خیرآبادی، تقطیع خورد، کاغذ، طباعت کتابت بہتر، صفحات ۲۲، قیمت ۵ روپیہ، ملنے کا پتہ مکتبہ حجاب رامپور

ماہنامہ حجاب رامپور خواتین اور طالبات میں دین کی دعوت کا کام عرصہ سے انجام دے رہا ہے، اس کے خاص نمبر بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں، زیرِ نظر شمارہ میں چار کہانیاں ہیں، جو اسلامی ذہن کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوں گی، ان کہانیوں کی زبان بہت سلیس ہے، کہانیوں کے اندر حکیمانہ مقولے، عارفانہ باتیں اور آیاتِ قرآنی نگینوں کی طرح جڑی گئی ہیں، ان کہانیوں میں سب سے سبق آموز کہانی کلر وہی، اس نے گناہوں میں آلودگی کے باوجود جس طرح سنت رسولؐ کی حفاظت کی اور اس راہ میں اُسے جس طرح وطن چھوڑنا اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا، بہت کم لوگ ایسی مردانگی کی ہمت کر سکتے ہیں، دیگر کہانیاں بھی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

(م ان)

……ـــ ۞ ـــ……

جلد ۱۲۵ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ضروری تصحیح

اس شمارہ میں ۲۴۵ سے ۲۵۲ تک ہندسے غلط ہو گئے ہیں، ناظرین اُن کو ۱۶۵-۱۷۲ سے تصحیح فرمالیں،

"منیجر"